NO.7243 Phone 808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1972

مقالہ

قائدِ اعظمؒ کے تصوّر کا پاکستان

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ———— دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ———— ایک پونڈ

جلد (۲۵) — فروری ۱۹۷۲ء — نمبر (۲)

فہرست

(۱) لمعات ———— ۲

(۲) حقائق و عبر۔ (ملعون خوشامد کی انتہا) (غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را)

(ایک دوسری وجہ) (جمہوری تماشہ) (خدا کے لئے کچھ کیجیے) ———— ۲۱

(۳) قائدِ اعظم کے تصور کا پاکستان ———— (محترم پرویز صاحب) ———— ۲۵

(۴) منافقین ———— ۴۹

(۵) نقد و نظر ———— (قرآنی کو ہکن کی جوئے شیر) ———— (محترم پرویز صاحب) ———— ۶۷

(۶) شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد ———— (محترم پرویز صاحب) ———— ۷۱

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ محمد اشرف - مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

قرآن کریم میں ہے۔ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲/۲۱۶) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بات بظاہر بڑی ناگوار گزرتی ہے لیکن درحقیقت اس میں تمہارے لئے بہتری ہوتی ہے۔ جو المیہ ہم پر حال ہی میں گزرا ہے وہ اس حقیقت کی تازہ ترین شہادت ہے۔

پرویز صاحب نے اپنے خطاب ۔۔ نالۂ بیباک ۔۔ میں جسے ہم نے دسمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا، لکھا تھا کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں ہم ایک بہت بڑے ہلاکت انگیز حادثہ سے خدا خدا کر کے بچ گئے۔ ہم قارئین کی تجدید یادداشت نیز موضوع زیر نظر کی نسبت سے ان کے وہ الفاظ درج ذیل کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

"ان مہیب زلزلوں میں سب سے زیادہ پُرخطرہ اور تباہ کن وہ تھا جو اسی سال کے شروع میں مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والا تھا۔ لیکن دست قدرت نے جس سے ہمیں بال بال بچا لیا۔ اس سے آپ کی نگاہ اس کشت وخون کی طرف منتقل ہوئی ہوگی جس کا آغاز وہاں ۳ مارچ سے ہوا۔ اور جو کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ لیکن میں اس کشت وخون اور تخریب و فساد کو زلزلہ انگیز خطرہ نہیں سمجھتا۔ وہ خطرہ اور تھا جس سے ہم اس کشت وخون کی وجہ سے بچ گئے۔ آپ غالباً حیران اور متعجب ہونگے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ وہ خطرہ کونسا تھا جس سے ہمیں اس کشت وخون نے بچا لیا۔ سنیئے کہ وہ خطرہ کونسا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جن مذموم عزائم کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھا وہ پہلے بھی کچھ ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ وہ اس کے چھ نکات کے نقاب سے چھن چھن کر باہر آ رہے تھے لیکن اب وہ بالکل ہی طشت از بام ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کو ان کا علم ہو گیا ہے۔ وہ پہلے پاکستان کے ٹکڑے کر دینا اور اس کے بعد اس کو دنیا کے نقشے سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ ان عزائم کو لے کر اس نے انتخابات لڑے اور ان میں ایسی اکثریت حاصل کر لی کہ مشرقی بنگال میں بھی اس کی غیر مشروط اور غیر مخلوط حکومت قائم ہو سکتی تھی، اور مرکز میں بھی وہ بلا منت غیرے اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا۔ اگر وہ اطمینان سے اپنی حکومت قائم کر لیتا تو وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر آئین بھی اپنی مرضی کا مرتب کر سکتا تھا اور قوانین بھی ایسے وضع جن سے وہ رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کو کمزور سے کمزور تر اور مشرقی پاکستان (یا اس کے اپنے الفاظ میں بنگلہ دیش) کو ہر لحاظ سے مستحکم سے مستحکم تر کئے چلا جاتا۔ چونکہ وہ یہ سب کچھ آئینی اور جمہوری طریق سے کرتا اس لئے کسی شخص کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہوتا۔ اگر کوئی شخص اسکی

مخالفت کرتا تو اسے بغاوت قرار دے دیا جاتا، اور چونکہ فوج پر بھی اس کا آئینی کنٹرول ہوتا اس لئے عندالضرورت، وہ اس بغاوت کو بزورِ شمشیر دبا دیتا۔ اس کے اس اقدام پر کوئی باہر کی قوم بھی طعنہ زن نہ ہوتی۔ اور جب وہ اتنی طاقت حاصل کر لیتا تو، یا تو آئینی طور پر ہندوستان کے ساتھ کنفیڈریشن کا رشتہ قائم کر لیتا یا اس کی سازباز سے، اس کے ساتھ جنگ چھیڑ کر اس میں شکست کھا جاتا۔ اور یوں اس مملکت کے جداگانہ وجود کو ختم کر دیتا۔ وہ ایسا کچھ نہایت آسانی سے کر سکتا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب تمام ذمہ دار ابنائے قوم اس کی منتیں کر رہے تھے کہ وہ اپنی آئینی حکومت قائم کر لے، فطرت کا جو نپچے ہاتھ نہایت غیر محسوس طریق سے اٹھا اور اس نے قوت کے نشہ میں مدہوش ہو کر آئینی طریق کے بجائے مسلح بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس سے کشت و خون اور قتل و غارت گری تو بے محابا ہوئی کہ فطرت کی تعزیریں قوموں کے اجتماعی جرائم کا کفارہ بڑا خطیر اور گراں طلب کیا کرتی ہیں لیکن خطۂ زمین اُس سازش سے بچ گیا جس کے نتیجے میں اس نے خاموشی ہی خاموشی میں ایک دن بھارت کا حصہ بن جانا تھا۔ یہ تھا عزیزانِ من! وہ مہیب خطرہ جس سے دستِ فطرت نے ہمیں ایک بار پھر بچا لیا۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے ہی نہیں، ساری دنیا کے سامنے ہے۔ مختصراً یہ کہ غدار مجیب کو نہایت ہوشیاری اور پرکاری سے، اپنی حفاظت میں رکھ کر حالات کو اس مقام پر لے آیا گیا جہاں وہی خطرہ پھر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے ہم نے جنوری ۱۹۷۲ء کی اشاعت (کے لمعات) میں یہ تنبیہ شائع کی تھی کہ،

"مشرقی پاکستان کی جس قدر تباہی ہو چکی ہے اس کی تعمیرِ نو کے لئے کروڑوں نہیں اربوں روپے درکار ہوں گے۔ اول تو ہمیں امید نہیں کہ ہندوستان اس کمرشکن بوجھ کو اٹھانے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ لیکن اگر اس نے ان لوگوں کو کسی حد تک امداد دی بھی تو اس کے عوض وہ اس سوختہ بخت ملک کو گرو رکھ لیں گے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان لوگوں کی حالت شودروں سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ مغربی پاکستان والوں کی انتہائی کوشش تھی کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی ہندو کی غلامی سے بچ جائیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنا خون تک بہا دیا لیکن وہ اس حد تک خودکشی پر تلے ہوئے تھے کہ ہماری کوئی کوشش بھی انہیں اس سے بچا نہ سکی۔ ہمیں ان کی حالت پر ترس ضرور آتا ہے لیکن دیدہ دانستہ زہر کھانے والے کو موت سے کون بچا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مجیب کے ساتھ جو گفتگوئے مصالحت کی تجویزیں ہو رہی ہیں، وہ مشرقی پاکستان میں محبوس ہماری فوج اور سول آبادی کے ادھر منتقل کرنے تک محدود رہیں گی اور ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دی جائے گی جس سے ہمیں مجیب کے ہاتھوں پھر سے وہ خطرہ لاحق ہو جائے جس سے ہم مارچ ۱۹۷۱ء میں کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے، اور مزید اس کمرشکن بوجھ بھی ہم پر آ پڑے۔ اب تو انہیں ہندوؤں کی سرپرستی کا مزہ چکھ ہی لینے دینا چاہئے۔ اُس وقت یہ لوگ اس موڈ میں ہوں گے کہ کوئی معقول بات سن سکیں۔"

اس تنبیہ کی ضرورت اس لئے بھی لاحق ہو گئی تھی کہ ملک (مغربی پاکستان) میں ایسے عناصر موجود تھے جو شروع ہی سے مجیب کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کا دم بھرتے چلے آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے بہت پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ مجیب کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے۔ پھر، اس سے بھی آگے بڑھ کر، انہوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا تھا کہ اسے رہا کر کے پورے پاکستان کا صدر بنا دیا جائے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مجیب کو ان مطالبات اور تجاویز کا علم تھا یا نہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر اقتدار کو مجیب سے ملنے دیا جاتا اور یہ "ایک عظیم پاکستان کے واحد حکمران بننے" کا افسون اسکے

کان میں پھونک دیتے' اور وہ اس دلکش تصور پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرکے' اپنی منافقت کے نقاب کو کچھ اور مدت تک اوڑھے رکھنے کا فیصلہ کرلیتا' تو ہماری حالت کیا ہوتی؟ وہ جیل سے رہا ہونے کے بعد' یا اس سے بھی پہلے چانکیہ سیاست کی مکارترین لومڑی ــــ اندرا ــــ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کرتا اور پھر یہیں سے اعلان کر دیتا کہ (۱) پاکستان ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرسکتی۔ (۲) سنہ ۷۰ء کے انتخابات ایک حقیقت ہے جو اب تک قائم ہے۔ (۳) ان انتخابات کی رُو سے' میں ملک کی کثیر ترین پارٹی کا لیڈر ہوں۔ (۴) وہ ڈکٹیٹر شپ جو جمہوریت کے راستے میں نہایت خطرناک رکاوٹ تھی' ختم ہوگئی۔ لہٰذا اب یہاں آئینی حکومت قائم ہوگی۔ وہ یہ اعلان کرتا اور آپ دیکھتے کہ یہاں اس کے جلوس نکالے' اور زندہ باد کے نعرے لگوائے جاتے۔ اسے پاکستان کا بطلِ جلیل قرار دیا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنے رفقاء کو بلا لیتا اور اپنی حکومت قائم کرلیتا۔ اپنی منشاء کے مطابق آئین بناتا۔ مشرقی پاکستان کی تعمیرِ نو کی آڑ میں' یہاں کی پائی پائی سمیٹ کر اُدھر لے جاتا۔ وہاں فوج رکھنے کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ بھارت سے (NO-WAR PACT) کرکے' اِدھر کی فوج کو کم سے کمتر کرتا چلا جاتا۔ (مجیب نے بہت پہلے اس پلان کا اعلان کیا تھا) خارجہ پالیسی اپنی اسکیم کے مطابق مرتب کرتا۔ یہ سب کچھ کرلینے کے بعد' جب مشرقی پاکستان کو مستحکم اور مغربی پاکستان کو کھوکھلا کر دیتا' تو نہایت اطمینان سے' آئینی طور پر' یا ایک جھوٹی (مصنوعی) جنگ کے ذریعے سارے پاکستان کو بھارت کی گود میں ڈال دیتا۔ بین الاقوامی سطح پر یہ تسلیم کیا جاچکا تھا کہ پاکستان میں مشرقی پاکستان اُمّ الریاست (MOTHER STATE) ہے۔ اگر مغربی پاکستان والے اس کے فیصلوں سے اختلاف کرتے تو وہ انہیں باغی قرار دیتا۔ اور ان کے خلاف یہ الزام لگاتا کہ یہ چھوٹا علاقہ' اُمّ الریاست سے علیٰحدہ ہونا (SECESSION) چاہتا ہے لہٰذا غدار ہے۔ اور اس بغاوت اور غداری کو بزورِ شمشیر کچل دیتا۔ اور انہی دلائل کی بنا پر جو ہم آج مشرقی پاکستان کے خلاف دیتے ہیں' اقوامِ عالم' مجیب کا ساتھ دیتیں ــــ اور اس طرح دو ہی چار سال کے عرصہ میں' پورے کا پورا پاکستان ختم ہو جاتا۔[۱]

یہ تھا وہ مہیب خطرہ جو ہمیں اس سوختہ بخت ملک کے افق پر اُمڈ کر منڈلاتا نظر آرہا تھا اور جس سے محفوظ رہنے کے لئے ہم نے وارننگ دی تھی کہ مجیب سے مذاکرات قیدیوں کے تبادلہ اور انتقالِ آبادی تک محدود رکھے جائیں ــــ بہرحال' یہ مبداءِ فیض کی کرم گستری ہے کہ اس نے اس تباہ کن خطرہ کو ایک بار پھر ٹال دیا اور ہمیں اپنی بازآفرینی کا ایک موقعہ اور دے دیا۔ مجیب بڑا زود رنج اور جذباتی واقعہ ہوا ہے۔ اس کے دل میں آتشِ انتقام اس شدت سے بھڑکی

---

[۱] آج (۱۷ جنوری کو) اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مجیب نے کہا ہے کہ اگر مسٹر بھٹو نے بنگلہ دیش کو دولتِ مشترکہ سے باہر رکھنے کیلئے کوئی چال چلی تو میں مغربی پاکستان کو بھی حاصل کرکے اسے بنگلہ دیش بنا لونگا۔ شیخ مجیب نے کہا کہ اگر مسٹر بھٹو اس موقف پر بدستور مصر ہیں کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان بدستور آئینی طور پر ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں تو میں ان کے اس مطالبہ کا جواب صرف ان الفاظ میں دے سکتا ہوں کہ بسر و چشم لیکن یہ نہ بھولئے کہ میں اکثریت کا لیڈر ہوں کیونکہ میں نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی تھی لیکن جناب والا! آپ صرف فوج کے بنائے ہوئے صدرِ مملکت ہیں اس لئے جمہوری اقدار کے مطابق پاکستان کا وزیرِ اعظم میں ہوں میں سارے صوبوں میں اپنی جماعت کے افراد متعین کرونگا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایسا کرنا پسند نہیں کرینگے لیکن اگر مسٹر بھٹو نے احتیاط سے کام نہ لیا تو میں یہ مطالبہ پیش کرونگا کہ مغربی پاکستان بھی میرا علاقہ ہے۔
(نوائے وقت - ۱۷ جنوری ۷۲ء)

کہ اس نے اُسے پاگل کر دیا۔ اس نے نہ یہاں کسی سے ملنے کی ضرورت سمجھی اور نہ اندرا یا اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کی۔ نہایت خفیہ طریق سے لندن پہنچا۔ اپنی منافقت کا پردہ چاک کیا اور گلے کے پورے زور سے اعلان کر دیا کہ "بنگلہ دیش" ایک خودمختار آزاد مملکت ہے۔ اور پھر اس "طرح" پر مصرعہ پر مصرعہ لگاتا چلا گیا۔ کہ پاکستان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم اس سے کسی قسم کا رابطہ یا واسطہ نہیں رکھیں گے۔ اگر کسی نے اس کی کوشش کی تو ہم اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیں گے۔ انڈیا کے ساتھ ہمارے دوامی تعلقات رہیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے جب یہ اعلانات کئے تو ہماری جان میں جان آئی کہ — رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

یہ نہ سمجھئے کہ ہم اس پر خوش ہیں کہ مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہو گیا! جس بدنصیب کے جگر کے دو ٹکڑے ہو جائیں، کیا وہ اس پر جشن مسرت منائیگا!! یہ زخم تو وہ ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوگا۔ اور پھر طلوع اسلام کے نزدیک تو پاکستان کا وجود ایک دینی تقاضا پورا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کا تحفظ ایک دینی فریضہ۔ اس کے ٹکڑے ہو جانا تو ایک طرف، وہ تو اس صدمہ کو بھی آج تک بھلا نہیں سکا کہ باؤنڈری کمیشن نے وہ علاقے ہندو کو کیوں دے دیئے جن میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت تھی۔ ہمارا موجودہ اطمینان کا سانس تو اس مریض کا سا ہے جسے نظر آ رہا تھا کہ اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جا رہی ہے لیکن فطرت کی کرم گستری سے اس کی ایک آنکھ بچ گئی۔ آیئے، ذرا جذبات سے الگ ہٹ کر، اس مسئلہ پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں۔

خطۂ زمین فی ذاتہٖ کوئی شے نہیں ہوتا۔ وہ تو مسکن ہوتا ہے ایک آبادی کا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں خطۂ زمین ہمارے ساتھ نہ رہا تو اس سے کہنا یہ مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آبادی، فلاں جماعت، فلاں قوم ہمارے ساتھ نہ رہی۔ سوال یہ ہے کہ کیا مشرقی پاکستان کی آبادی ہم میں سے تھی جو اس کا ہم سے الگ ہو جانا ایک غیر متوقع حادثہ یا تعجب انگیز واقعہ فلہٰذا اچانک صدمہ کا موجب سمجھا جائے؟ اگر ہم سطحی جذبات کی خود فریبی سے الگ ہو کر سوچیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ وہ آبادی اب ہم میں سے نہیں رہی تھی۔ (اس میں شبہ نہیں کہ اس کے ایسا ہو جانے کی ذمہ داری خود ہم پر عاید ہوتی ہے۔ لیکن اس کا ذمہ دار کوئی بھی کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ وہ آبادی ہم میں سے نہیں رہی تھی) ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو (یا شاید دنیا کو) فریب دیتے رہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے باشندوں میں ایک ایسی قدر مشترک ہے جو رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی بُعد کے باوجود، ہمیں ایک قوم بنائے ہوئے ہے۔ اور وہ قدر مشترک ہے نظریہ کا اشتراک، نصب العین کی ہم آہنگی، یعنی اسلام۔ یہ فریب تھا۔ ملمع تھا جو ایک تا ؤ ملنے پر ہر وقت اتر سکتا تھا۔ وہاں کی نئی نسل، نظریۂ حیات اور نصب العین زندگی میں ہم سے کس حد تک مختلف ہو چکی تھی اس کے متعلق ہم متعدد بار شرح وبسط سے لکھ چکے ہیں (اور ۱۹۵۳ء سے مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں)۔ اس وقت ہم وہاں کی نوجوان نسل کے ترجمان، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے طالب علم عزیز الرحمٰن کا وہ خط دوبارہ شائع کرتے ہیں جو طلوع اسلام بابت جون ۱۹۶۱ء میں آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ:

> غنیمت ہے کہ ہم بنگالیوں میں اب بیداری کے آثار نمودار ہو رہے ہیں ورنہ ہماری حالت تو یہ ہو چکی تھی کہ ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ، طارقؒ، موسیٰؑ اور (حضرت) علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے

> لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی، بدیشی خدا کو اپنا معبود بنا لیا تھا جسے اللہ کہا جاتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگنی اور دکھا گنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔

کہیئے کہ نیل ہم میں سے تھی ہ؟ اور آگے بڑھیئے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد "بنگلہ دیش" کے قائمقام صدر - نذر الاسلام — نے جشنِ مسرت مناتے ہوئے جو تقریر کی تھی، اسے بھی دوبارہ سامنے لایئے۔ اس نے کہا تھا کہ

> ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی ایک غلط نظریہ پر۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا معیار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور حکومت کی بنیاد دین پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل۔ اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے اس غلط مفروضہ کی بنا پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے۔ وہ باطل تھا، اور حق وہی تھا جسے ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل کو مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے سے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

کہیئے! ان لوگوں کو آپ "پاکستانیوں" میں شمار کر سکتے ہیں؟ — یہ تو خیر پھر بھی متبعین میں سے تھے، خود مجیب الرحمٰن کے کیا خیالات ہیں؟ اس کا اندازہ اس کی اس تقریر سے لگایئے جو اس نے ڈھاکہ پہنچنے پر کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ:

> میری قوم سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نظریات کی حامل ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ میری پالیسی اور اندرا گاندھی کی پالیسی میں اس قدر توافق کیوں ہے۔ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ ہم دونوں کے نصب العین، زاویۂ نگاہ اور اقدارِ حیات ایک ہیں۔　　(پاکستان ٹائمز - ۱۱ جنوری ۱۹۷۲ء)

آپ فرمایئے کہ جس قوم کے نظریاتِ حیات اور اقدارِ زندگی وہ ہوں جو مسز اندرا گاندھی (اور اس کی قوم) کے ہیں، کیا وہ قوم پاکستانی قوم کا جزو قرار پا سکتی ہے؟ اور یہ چیز یونہی کسی ہنگامے کا پیدا کردہ حادثہ نہیں۔ مجیب نے اپنی اسی تقریر میں کہا ہے کہ "یہ میرے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے"۔ اور ابھی تو اس طربیونل کی رپورٹ سامنے نہیں آئی جس نے اس کے حالیہ مقدمہ کی تفتیش کی تھی۔ وہ شائع ہو جائے تو معلوم اس ناٹک کے اور کون کونسے پہلو نمودار ہوں۔

آپ سوچئے کہ کیا ان تصورات کی حامل قوم ہم میں سے تھی یا ہمارے ازلی دشمن ہندوؤں میں سے، جن سے ہم اسی بنا پر الگ ہوئے تھے کہ ان کا اور ہمارا نظریات کا اختلاف ہے۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ کیا ایسی قوم کا جو کسی مصلحت یا مجبوری کے ماتحت، منافقانہ طور پر، ہم میں شامل تھی، ہم سے الگ ہو جانا، اطمینان کا باعث ہے یا پریشانی کا موجب!

اگر کسی شخص کی آستین سے سانپ نکل کر الگ ہو جائے تو اس پر اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے یا خون کے آنسو رونا!!

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا، ہم نے انتہائی کوشش کی کہ یہ لوگ ہم سے الگ ہو کر ہندوؤں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں نہ پہن لیں۔ لیکن جب وہ ذہنی اور قلبی طور پر ان کی غلامی اختیار کر چکے تھے تو آپ ان کے جسموں کو اس غلامی سے کب تک محفوظ رکھ سکتے تھے۔ جسدِ پاکستان کا یہ حصہ سرطان (CANCER) زدہ ہو چکا تھا' اور لاعلاج۔ اگر یہ الگ نہ ہوتا تو رفتہ رفتہ سارے جسم میں سرطان کا زہر پھیل جاتا۔ اس ناسور کے الگ ہو جانے سے' باقی جسم کے محفوظ رہنے کا امکان تو ہو گیا۔ یہ وجہ ہے کہ ہم اس حادثہ کو' اس قدر الم انگیز ہونے کے باوجود' وجہِ تشکر سمجھتے ہیں۔ اب ہمیں اپنی ساری توجہ اس حصۂ جسم کی صحت، تنومندی، استحکام پر مرکوز کر دینی چاہیئے جو اس عملِ جراحی کے بعد باقی بچ گیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ اشاعت میں لکھا تھا، خطۂ زمین کی محدودیت کچھ حتمی نہیں ہوتی۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے نتیجہ میں جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ لیکن اس کے آدھے حصے نے' چند ہی دنوں میں وہ ترقی کی کہ اب اس کا شمار دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے کچھ قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کا حل آئینی اور قانونی طور پر کرنا چاہیئے (اور صدر بھٹو جو بار بار کہہ رہے ہیں کہ ان کے مجیب کے ساتھ مذاکرات کے امکانات ہیں تو ان سے ہمارے خیال میں انہی قانونی پیچیدگیوں کا حل مقصود ہے) ہمیں' ہر حال اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیئے کہ 'بنگلہ دیش' پر سے انڈیا اپنا تسلط چھوڑ دیگا اور مجیب ہم سے پھر مل جائے گا۔ اس سلسلہ میں کشمیر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی (یو۔این۔او) کی قرار دادیں، گہرے حروف میں لکھی ہوئی موجود ہیں وہاں کے باشندے پاکستان سے الحاق کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اس کا ایک حصہ ہمارے قبضے میں بھی ہے لیکن اس کے باوجود ہم اسے آج تک حاصل نہیں کر سکے۔ محض آئینی طور پر یہ کہتے رہنے سے کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ نہیں' وہ متنازعہ فیہ علاقہ ہے' ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس دور میں نہ قاعدے قانون کو کوئی پوچھتا ہے، نہ عدل و انصاف کی کہیں شنوائی ہوتی ہے۔ سابقہ لیگ آف نیشنز بھی یا حالیہ اقوامِ متحدہ' سب' اقبال کے الفاظ میں، قیریں تقسیم کرنے کے لئے کفن چوروں کی انجمنیں ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ کفن ہمیشہ مردے کا چرایا جاتا ہے' زندہ کا نہیں۔ اس لئے اگر ہم اپنی متاع کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک زندہ قوم بننا ہوگا۔ اگر ہم نے اپنے اندر قوت پیدا کر لی تو کشمیر بھی حاصل ہو جائے گا اور مشرقی پاکستان بھی۔ لیکن اگر ہم کشمیر کی طرح مشرقی پاکستان کے متعلق بھی محض اس "وظیفہ" کو دہراتے رہے کہ وہ ہمارا علاقہ ہے تو یہ اس قسم کی خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ

متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرضِ رہزن پر

رہزن سے متاعِ بردہ' قوت سے چھینی جاتی ہے' منتوں سے مانگی نہیں جاتی ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ہماری اس متاعِ گراں بہا کا فی الواقعہ رہزن بھارت ہے' مجیب نہیں۔ مجیب تو محض مداری کا بکرا ہے جس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ یہ شخص اس قدر فریب خوردہ ہے کہ پاکستان سے رہا ہونے کے بعد سیدھا انگریز کے ہاں گیا۔ اگر اس کی آنکھوں پر نفرت اور انتقام کی پٹی نہ بندھی ہوتی اور تاریخ کے ایک صفحہ پر بھی اس کی نگاہ ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کی قوم (بنگالیوں) کے متعلق انگریز کے خیالات کیا ہیں۔ لارڈ میکالے نے ایک کتاب لکھی تھی (RACES OF INDIA) وہ اسے اٹھا کر دیکھ لے کہ اس میں اس نے بنگالیوں کے متعلق کیا لکھا ہے۔

اس کے بعد وہ دہلی پہنچا جہاں اسے وہ پنجرہ نظر نہ آیا جس میں (اندرا کے چچا جان) شیخ عبداللہ بند ہیں اور چلّا چلّا کر ہر غدار سے کہہ رہے ہیں کہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے

اور پھر وہ ڈھاکہ گیا جہاں اسے اتنا بھی دکھائی نہ دیا کہ میر جعفر کا کیا حشر ہوا تھا؟ ہمیں اس فریب خوردہ مہرے' اور اس کے ساتھ اس کے متبعین کی حالت پر افسوس ضرور آتا ہے' لیکن

جو مُنہ ہی جا لگا ہو تو غمخوار کیا کرے؟

مجیب کو باز آفرینی کے دو نادر مواقع ملے لیکن بجائے اس کے کہ وہ اسے غنیمت سمجھ کر اپنی اصلاح کرتا اور زیادہ تخریب کار ہو گیا۔ یہ اس لئے کہ اگر کوئی مجرم، جیل جا کر، اپنے جرائم پر نظرِ ثانی کرے، ان سے نادم اور منفعل ہو اور آئندہ کے لئے پُر امن رہنے کا عہد کرے اور اس طرح معافی مل جانے پر باہر آجائے تو وہ اپنی اصلاح کر سکتا ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ ایک ڈاکو قید ہو جائے اور اس کے ساتھی ڈاکو جو باہر ہوں، جیل کے دروازے توڑ کر اسے بھگا لے جائیں، تو وہ باہر نکل کر پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ڈاکو بن جائے گا۔ مجیب اگرتلہ سازش کے مقدمہ میں ملوث ہوا، تو خود پاکستان کے "لیڈرانِ کرام" نے دباؤ ڈال کر اس مقدمہ ہی کو ختم کرا دیا۔ اس کے بعد جب وہ باہر آیا ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ سرکش تھا۔ اب اس نے (سال گزشتہ) جو کچھ کیا وہ سازش، غداری، سفاکی اور قصابی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اسے گرفتار کیا تو ایک لاڈلے مہمان کی طرح اس کی خاطر مدارات ہوتی رہیں' اور اس کے بعد پاکستان پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا اور خالص غنڈہ پن (GANGSTERISM) سے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ اسے مجبوراً رہا کرنا پڑا۔ اس طرح رہا ہونے پر اس کی سرکشی اور انتقام جوئی کا جو عالم ہو سکتا ہے اسے اس نے چھپا کر نہیں رکھا۔ لیکن اُس کا ردِ عمل کچھ ہی کیوں نہ ہو' ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ غداری، بغاوت اور نسل کشی جیسے سنگین اور انسانیت سوز جرائم کا مجرم تھا اور اب بھی مجرم ہے۔ (اس میں اور یحییٰ خان میں کوئی فرق نہیں) اور جو لوگ اسے محبِ وطن کہتے ہیں ان کی حبّ الوطنی خود محلِ نظر ہے۔ اس سے ہمیں کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ وہ ہمارا بدترین دشمن ہے اور ایک اور بدترین دشمن (بھارت) کا آلۂ کار جس کی ہمارے دو اور بدترین دشمنوں (روس اور امریکہ) سے ملی بھگت ہے۔

(٭)

جس طرح ہمیں مجیب سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے اسی طرح ہمیں کسی یورپی طاقت' روس، امریکہ، برطانیہ وغیرہ' یا یو۔ این۔ او سے بھی کسی ہمدردی یا انصاف کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری

اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

ہم اپنی اس طفلانہ طبیعت کی وجہ سے یورپ کے شکر پارہ فروشوں سے مات کھاتے چلے آرہے ہیں۔ روس نے نہایت ہمدردانہ نقاب میں' بقائے باہمی کے پردے میں' بھارت اور پاکستان میں تاشقند کا معاہدہ کرایا اور پھر بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کو اس کے آدھے حصے سے محروم کر دیا۔ امریکہ نے اسرائیل جیسی ذلیل ترین قوم کے ہاتھوں' تمام عربی ممالک کو اس قدر رسوا کن پوزیشن میں دھکیل دیا جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اس کے بعد اس نے حالیہ المیہ میں

ہمارے خلاف جس قدر فریب کارانہ رول ادا کیا اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ ہمیں پوری پوری امداد کا یقین دلا کر روس اور بھارت کے ساتھ بھڑا دیا۔ متحدہ اقوام کی مجلس میں ایسا ایکٹنگ کیا کہ سارے تماشائی مبہوت ہو گئے۔ اپنے بیڑے کی دکھاوے کی نقل و حرکت سے ہمیں اس دھوکے میں رکھا کہ ــ وہ آئی، لے وہ آئی، دل ناصبور صبح ــ اور پردہ اٹھ جانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ نہ صرف یہ کہ اس نے ہماری کوئی مدد نہ کی، جو قومیں ہماری کچھ امداد کرنا چاہتی تھیں انہیں بھی اس نے روک دیا۔ چنانچہ خود امریکی کالم نگاروں کی وساطت سے یہ خبر منصۂ شہود پر آئی ہے کہ جنگ کے دوران شاہ حسین کچھ بمبار طیارے پاکستان کو دینا چاہتا تھا لیکن امریکہ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا (پاکستان ٹائمز ــ یکم جنوری ۱۹۷۲ء) یہ کچھ کرنے کے بعد امریکہ پھر ایک نہایت مشفق اور غمخوار دوست کا نقاب اوڑھ کر ہمارے سامنے آیا اور جناب نکسن نے بڑے ہی ناصحانہ انداز سے کہا کہ اہل پاکستان کو ہمارا اور روس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ہم نے انہیں مکمل تباہی سے بچا لیا، ورنہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد روس اور بھارت کا ارادہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس طرح پاکستان کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ ہم نے (امریکہ نے) روس سے کہا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ اس نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمایا جس کے لئے ہم اس کے شکر گزار ہیں۔ پاکستان والو! تم بھی اس کے اور ہمارے شکر گزار رہو (پاکستان ٹائمز۔ ۲۸/۱۲) اس ناصحانہ مشورہ کا دوہرا وار تھا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان پر افسردگی اور مایوسی بری طرح چھا رہی تھی۔ عین اس عالم میں انہیں ڈرایا گیا کہ یاد رکھو! روس کی تلوار تمہارے سر پر ہر وقت منڈلا رہی ہے۔ وہ تمہیں جس وقت چاہے ہڑپ کر سکتا ہے۔ اس کی گرفت سے تمہیں ہم ہی بچا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہر وقت شکر گزار رہو اور ہم سے بگاڑنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم روس جیسے کھلے ہوئے بدکردار دشمن کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہیں اور امریکہ جیسے منافق سے بھی بگاڑ پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اور مقصد ان دونوں کا یہ ہے کہ ہم چین کی طرف نہ جھک جائیں۔ اس سلسلہ میں سینٹو کے سبکدوش ہونے والے سیکرٹری جنرل مسٹر جیٹ سیگلو نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ

> روس، چین کی جغرافیائی پوزیشن سے بے حد خائف تھا اور اسے ضرورت تھی کہ وہ کوئی ایسا حلیف تلاش کرے جو چین کا توڑ ثابت ہو۔ بھارت کو بھی روس کی پریشانی کا علم ہو گیا۔ چنانچہ اس نے روس کو بتایا کہ وہ چین کا مقابلہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک مضبوط پاکستان موجود ہے۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ۱۹۶۲ء میں اسے چینیوں سے اس لئے ہزیمت اٹھانی پڑی کہ اس کی فوج کا کثیر حصہ پاکستان کی طرف سرحدوں کی حفاظت پر متعین تھا۔ روس بھی بھارت کے نقطۂ نظر کو سمجھ گیا جو ان دونوں ملکوں کے معاہدہ پر منتج ہوا جس نے روس کی طرف سے بھارت کو یقین دلایا کہ وہ چین کو اس کے خلاف نبرد آزما نہیں ہونے دیگا۔ بھارت کو بھی اس قسم کا اطمینان اپنے منصوبے کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے درکار تھا۔ (نوائے وقت ۱/۱۰)

مسٹر سیگلو نے اپنے اس بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے پناہ گزینوں کا مسئلہ یا مجیب کی گرفتاری تو محض ایک بہانہ تھا ورنہ بھارت اس سے بہت پہلے، پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اور اقوام متحدہ کے متعلق اس نے کہا ہے کہ:

> میں نے اقوام متحدہ میں چار سال گزارے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان چار سالوں میں میں نے کیسے کیسے

شرمناک واقعات دیکھے ہیں۔ لیکن موجودہ سکینڈل تو ایسا ہے کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
یہ ہیں پاکستان کے سلسلہ میں اقوامِ مغرب، روس، امریکہ وغیرہ کی چالیں، بھارت کے عزائم، اور کفن چوروں کی جماعت — اقوامِ متحدہ — کے مگرمچھ کے آنسوؤں کی کیفیت۔

(۰)

پھر جس طرح ہمیں اقوامِ مغرب کیطرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے اسی طرح ہمیں اس خود فریبی سے بھی جس قدر جلد ممکن ہو، نکل جانا چاہیئے کہ ہم میں اور دیگر مسلم مملکتوں میں اسلام کی بنا پر رشتۂ اخوت و مودت موجود ہے اور وہ آڑے وقت میں ہمارا ساتھ دینگی۔ اسلام یقیناً ایک ایسا رشتہ پیدا کرتا ہے۔ اور وہ رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ مکمل اور پائیدار ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت جب یہ ہے کہ آج دنیا میں کسی مملکت کی بنیاد بھی اسلام پر نہیں تو اسلام کا پیدا کردہ رشتہ کہاں سے مل سکے گا؟ اقبال کی قرآنی فکر کے تصدق، ہندی مسلمانوں کے دل میں اس اسلامی اخوت کا جذبہ بڑی حد تک بیدار ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کسی مسلم مملکت پر کوئی مصیبت آتی تھی تو ہم پر خواب و خور حرام ہو جاتا تھا۔ یہ جذبہ اس حد تک بیدار، بلکہ شدید تھا کہ (انگریز کی غلامی کے باوجود) ہم نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں یہ قرارداد پاس کی تھی کہ انگریز جس فوج کو ترکوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار کر رہا تھا، ہندی مسلمانوں کے لئے اس فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کر دے، اس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے — یہ جذبہ، ہماری "جلنے والی نسلوں" کے دل میں کسی حد تک اب بھی موجود ہے۔ لیکن ہماری آنے والی نسلیں اس سے بے بہرہ ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ ہمارے ہاں، ایک سازش کے ماتحت، ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اقبال کے پیغام سے بیگانہ بنا دیا گیا ہے، اور عوام کے لئے بھی اس کا مصرف قوالوں کی ڈھولک سے باہر کہیں نہیں رہا، اور دوسرے اس لئے کہ مسلم ممالک کیطرف سے ہمارے لئے کبھی اس قسم کی تڑپ اور خلش کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ اور اب تو ان کے ہاں وطنی اور نسلی قومیت کی گرہیں اس قدر مضبوط ہو چکی ہیں کہ ایک دوسرے کے لئے بھی ان کے دل میں خیر سگالی کی کوئی رمق نہیں رہی — حالیہ جنگ میں آپ نے یہ جگر پاش منظر دیکھا ہوگا کہ بھارت اور روس نے ہمارے ساتھ یہ کچھ کیا، اور ہمارے "اسلامی ممالک" میں سے (ایک آدھ کے سوا) کسی نے انہیں مجرم تک بھی نہیں کہا۔ لہٰذا محض "اسلامی رشتہ" کی بنا پر یہ سمجھنا کہ ان سے ہمیں کسی قسم کی مدد مل سکے گی، یا کسی آویزش میں یہ بالضرور ہمارا ساتھ دینگے، امید موہوم ہے جسے ہمیں دل سے نکال دینا چاہیئے۔ اور بھروسہ صرف اپنی قوتِ بازو پر رکھنا چاہیئے۔

(۰)

یہ ہیں وہ بیرونی اور اندرونی حالات جن میں اس بچے کھچے حصہ ملک کے مستقبل کی ذمہ داری مسٹر بھٹو کے سر پر ڈال دی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا، یہ غنیمت تھا کہ اس وقت مسٹر بھٹو یہاں موجود تھا۔ اور موجود بھی تھا ایک منتخب اکثریتی پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ دیکھتے کہ یہاں یا تو تباہ کن خانہ جنگی شروع ہو جاتی، یا یحییٰ خان کی جگہ کوئی اور فوجی شخص سنبھال لیتا۔ ایسے نازک وقت میں مسٹر بھٹو کی ہستی مغتنمات میں سے ثابت ہوئی، اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس شخص کی ہمت اور ملک کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس آسمان شکن بوجھ کے اٹھانے پر آمادہ ہو گیا۔ اب یہ اقتدار پھولوں کی سیج نہیں تھا، کانٹوں کا بستر تھا۔ ہم مسٹر بھٹو کی کمزوریوں سے

بھی واقف ہیں اور اس کی پارٹی کو بھی فرشتوں کی جماعت نہیں سمجھتے۔ ہم ان پر کڑی نکتہ چینی کرتے رہے ہیں (اور کرتے رہیں گے) بایں ہمہ ہم نے جو کہا ہے کہ اس وقت مسٹر بھٹو کی ہستی بہر نوع غنیمت ہے تو یہ اس لئے بھی کہ اس شخص کا ماضی، کم از کم قوم فروشی کے دھبوں سے داغدار نہیں۔ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ شخص اس خطہ زمین کو غیروں کے ہاتھ بیچ نہیں دیگا۔ ہم اس وقت پھر اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر ۱۹۴۷ء میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی نازک تر مقام پر۔ اُس وقت اگر ہم بے سر و سامان تھے، تو تشتت و انتشار کا تو یہ عالم نہیں تھا۔ ملک کی سالمیت محفوظ تھی۔ پارٹیوں کا وجود کوئی نہیں تھا۔ مذہبی پیشوائیت کا "مقدس جال" اس وسعت اور گہرائی سے پھیلا ہوا نہیں تھا۔ لٹے پٹے کاروانوں کے دل میں خلوص و ایثار کا جذبہ موجزن تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مملکت کا درخشندہ مستقبل ہر ایک کی نگاہوں میں تھا۔ اس کے برعکس آج بے سر و سامانی کا عالم اس سے بھی زیادہ یاس انگیز ہے۔ ملک کا آدھا حصہ نذر غیر ہو چکا ہے۔ مملکت غداروں سے بٹی پڑی ہے۔ ملت پارٹیوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہو چکی ہیں۔ ایک طرف امریکی اثرات کی خاموش لہریں، قصر مملکت کی بنیادوں تک کو بہالے جانے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف روس نواز عناصر۔ اُس کے اس قدر کھلے ہوئے پاکستان دشمن رویہ کے باوجود۔ کھلے بندوں ملک میں انتشار پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ ہیں وہ حالات جن کے پیش نظر ہم نے کہا ہے کہ اس وقت ہم ۱۹۴۷ء سے بھی زیادہ نازک مقام پر کھڑے ہیں جس سے مسٹر بھٹو کو --- جس نے اس ... بار امانت کے اٹھانے کی ہمت کی ہے -- حالت یہ ہے کہ

کشتیاں ٹوٹ گئی ہیں ساری   اب لئے پھرتا ہے دریا ہم کو

ہم نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا کہ اس وقت کرنے کے کام ... دو ہیں۔ ایک یہ کہ ایسا انتظام کیا جائے جس سے یہ خطہ زمین کسی طرح سے محفوظ رہ جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ہماری آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے، جس سے یہ اس مقصد کو پورا کرنے کی اہل ہو جائے جس کے لئے اس خطہ زمین کو حاصل کیا گیا ہے۔ آج ہم پھر اپنے اسی مشورہ کو دہراتے ہیں کہ اس وقت سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کو ایسا طاقتور بنا دیا جائے کہ کوئی بیرونی طاقت اس کی طرف نظر بد سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کے لئے نہایت ضروری ہے کہ یہاں پانچ دس سال تک ایک مستحکم آئینی حکومت قائم رہے۔ یہاں کے تخریبی عناصر نے ابھی سے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ مثلاً جماعت اسلامی نے اپنا وہی پرانا حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی اس نے نہایت معصومانہ انداز میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے کہ:

> پاکستان اسلام کے لئے لیا گیا تھا۔ آج نہ صرف مشرقی پاکستان میں بلکہ مغربی پاکستان میں بھی "لادینی اشتراکی" ریاست کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔۔۔۔ مشرقی پاکستان ٹوٹنے سے مسلمان کا بازو ٹوٹا ہے۔ اشتراکی اور لادینی کی ہڈی تو جڑی ہے۔ اس کو سکون ہے کہ اس کے نصب العین کی ایک ریاست اُدھر قائم ہو گئی ہے۔ ایک اِدھر قائم ہوا چاہتی ہے۔ (ایشیا - ۲۶ ۱۲/۷۱)

اس کے ساتھ، اس کے "مجاہدین" کی جماعت (جمعیت الطلبا) نے بھی اِدھر اُدھر خلفشار مچانا شروع کر دیا ہے۔ دوسری طرف اصغر خان صاحب ہیں جن کے خدمات قومی کے خریطہ میں اس سے زیادہ کوئی متاع نہیں کہ وہ ریٹائرڈ ایئر مارشل ہیں۔ انہوں نے ابھی سے کہنا شروع کر دیا ہے کہ

> میں اپنی تمام کوششیں اس مقصد کے لئے صرف کر دوں گا کہ رائے عامہ کو اس نقطہ پر مرکوز کیا جائے کہ

موجودہ حکومت کو آئینی طریق سے الگ کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مجھے خطرہ ہے کہ مغربی پاکستان کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے۔ (پاکستان ٹائمز - ۱/۲ ۱۲)

اس مقصد کے لئے، ان کے نزدیک، پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ "بنگلہ دیش کو فوراً تسلیم کر لیا جائے۔" بے غیرتی کی بھی کوئی انتہا ہونی چاہیئے۔ ہم نے تو آج تک اسرائیل کو بھی تسلیم نہیں کیا! یہ اور انہی کے قماش کے دیگر تخریبی عناصر نے ابھی سے یہ "مقدس" مہم شروع کر دی ہے۔

(۱)

اس خطۂ زمین کے استحکام کے لئے سب سے پہلے اس کی بے حد بگڑی ہوئی اقتصادی حالت کا سنبھالنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم کو سادہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہی نہیں بلکہ مجبور کیا جائے۔ حال ہی میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ سرکاری ملازمین کا لباس اچکن اور پتلون پر مشتمل ہو گا۔ یہی لباس چین میں رائج ہے۔ یہ اقدام بھی مناسب ہے لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔ سوال صرف کسی خاص وضع قطع یا تراش خراش کا نہیں۔ اس کے لئے مسٹر بھٹو کو سب سے پہلے خود "ماؤزے تنگ" بننا چاہیئے۔ اس کے بعد قانوناً فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کسی قسم کا (FINE CLOTH) باہر سے درآمد نہیں کیا جائے گا۔ اور اندرونِ ملک جس قدر فائن کلاتھ تیار کیا جائے گا اسے برآمد کیا جائے گا۔ ملک میں صرف موٹا جھوٹا (رف کلاتھ) استعمال کیا جائے گا۔ اس کے مختلف رنگ اور پرنٹس ہو سکتے ہیں لیکن کوالٹی کے لحاظ سے اسے رف ہی ہونا چاہیئے۔ اس طرح جہاں تک لباس کا تعلق ہے، ملک خود بخود سادگی پر اتر آئے گا۔

اس کے ساتھ ہی، سامانِ تعیش (LUXURY GOODS) کی درآمد اور ساخت بھی ممنوع قرار دے دی جائے اور بڑی بڑی کاروں کی درآمد پر بھی پابندی لگا دی جائے۔ بڑے بڑے محلات نما مکانات کی تعمیر بھی روک دی جائے۔ ملک کے فلک بوس ہوٹلوں کو قومی تحویل میں لے کر ان کی عمارتوں کو کسی بہتر مصرف میں لایا جائے۔ اور ان کی جگہ نہایت سادہ سی قیام گاہیں تعمیر کی جائیں۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر اقدامات سے سادہ زندگی بسر کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا جائے۔

(۲) ہمارے ملک کی معیشت زرعی ہے۔ ہم بتکرار و اصرار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے "زمین" پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے تمام انسانوں کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہی اس کا مصرف ہے۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کو رزق میسر آتا رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہو گا کہ اس کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ ہم مختلف ممالک سے اپنی ضروریات کے مطابق، ٹیکنیکل ایڈوائزرز (فنی مشیروں) کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ایک نشوونما پانے والے ملک کو اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جہاں تک زرعی انتظامات کا تعلق ہے۔ ہمارے زمانے میں چین نے اس باب میں نہایت کامیاب تجربہ کیا ہے۔ ہمیں اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ چین سے چند ایک زرعی ماہرین کی خدمات مستعار لی جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ ہمارے حالات کے مطابق، ایک تفصیلی پروگرام مرتب کر دیں۔ اس پروگرام پر غور کر لیا جائے اور پھر بقدرِ امکان اس پر عملدرآمد شروع کر دیا جائے۔ یہ مسئلہ اسی طرح سے حل ہو گا۔ زمینوں کو اپنی تحویل میں لے کر محض ان کی تنظیمِ نو سے مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا یاد رکھیئے۔

اصولی مقصد یہ ہے کہ زمین سے رزق حاصل کرکے اس کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات پوری کرسکے۔ اس اصولی مقصد کے لئے عملی پروگرام کو نساوضع یا اختیار کیا جائے۔ یہ حالات پر منحصر ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھیئے کہ اصلی مسئلہ کا حل اس سے بھی نہیں ہوسکے گا کہ چند صنعتی اداروں کو سرکاری تحویل میں لے لیا جائے۔ قرآن کی رُو سے صحیح معاشی نظام کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی ہر ایک کی پوری ہوتی رہیں اور زائد از ضرورت دولت کسی کے پاس نہ رہے جس سے وہ پرائیویٹ پراپرٹی بنا سکے۔ جب تک یہ دو بنیادی اصول کارفرما نہیں ہوتے معاشی ناہمواریوں کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

(۳) اسی طرح، یہ مسئلہ اس سے بھی حل نہیں ہوسکتا کہ مزدوروں (کام کرنیوالوں) کی اجرتیں بڑھا دی جائیں۔ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوسکیگا کہ کام کرنیوالوں کو اتنا دیا جائے جس سے ان کی ضروریاتِ زندگی باطمینان پوری ہوجائیں۔ اس سلسلہ میں بنیادی سوال اشیائے ضروریہ کی قیمتوں پر کنٹرول کا ہوگا۔ جب تک اس کا انتظام نہیں کیا جائیگا افلاس کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ہم پھر دہرا دیں کہ قرآن کریم کی رُو سے مملکت کا فریضہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو اس امر کی ضمانت دے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۱)

ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اور تمہاری اولاد کی بھی۔

یہ ضمانت آجتک دنیا کا کوئی نظام نہیں دے سکا۔ حتیٰ کہ نہ روس دے سکا ہے نہ چین ــــ یہ ضمانت صرف قرآن کے معاشی نظام نے دی تھی، اور وہی نظام آج بھی دے سکتا ہے۔ جو مملکت قرآن کے اس نظام کو رائج کرسکے گی وہی اسلامی کہلا سکے گی اور وہی نوعِ انسان کی محسن ہوگی۔

(۵)

اس کے بعد اس خطۂ زمین کے تحفظ کے لئے عسکری نظام کا سوال سامنے آتا ہے۔ اہلیت، صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ سے ہماری فوج کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا تھا۔ سامانِ حرب وضرب اور تعداد کی نسبتاً کمی کے باوجود ان کی کامیابی کا راز ان کی یہ خصوصیات بھی تھیں۔ لیکن ان سے بھی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ قوم کے دل میں فوج کا بڑا احترام تھا۔ آپنے ۱۹۶۵ء میں دیکھا تھا کہ جن راستوں سے ہمارے جیالے سپاہی گزر جاتے تھے، قوم ان راستوں کی مٹی کو چومتی تھی۔ اس جنگ میں ہماری افواج کی قابلِ صد رشک کامیابی کے بعد ہمارے خلاف جو سازشیں ہوئیں، ان میں سب سے گہری سازش یہ تھی کہ قوم کے دل سے فوج کا احترام ختم کردیا جائے۔ پاکستان کے دشمنوں اور غداروں نے اس سلسلہ میں ایسے منظم اقدامات کئے جن سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ آج قوم کے دل میں فوج کے لئے وہ پہلے سے جذباتِ احترام وتکریم نہیں رہے۔ اور یہ دشمنوں کی سب سے بڑی کامیابی اور ہماری سب سے بڑی شکست ہے۔ یاد رکھیئے! ہماری فوج آج بھی ویسی ہی کندن ہے جیسی پہلے تھی۔ اس کی صرف ہائی کمان میں کچھ غدار پیدا ہوگئے۔ اور کچھ وہ جن کا ذاتی کردار نہایت گھناؤنا نکلا۔ دشمنوں کی سازش نے ان کے اس کردار واطوار کو اس شد ومد سے اچھالا کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے پاکستان کی تمام فوج بدقماش، بدکردار اور غدار ہے۔ یہ ہمارے دشمنوں کی بڑی گہری چال تھی جس کے فریب میں ہم آگئے ضرورت ہے اور اشد ضرورت کہ اس اثر کو جس قدر جلد ممکن ہو زائل کیا جائے اور قوم کے دل میں فوج کا وہی پہلا سا وقار اور احترام پیدا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم سے ایک اور غلطی بھی ہو رہی ہے۔ ہائی کمان کے

جو جرنیل ملک کے ساتھ غداری کے الزام سے متہم اور بدکرداری کی نجاست سے ملوث تھے، ان کا الگ کیا جانا ضروری تھا۔ الگ کیا جانا ہی نہیں، انہیں عبرت انگیز سزائیں دینا بھی ــــ انہیں الگ کیا گیا۔ اس کے بعد بھی جرنیلوں وغیرہ کی علیحدگی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس سے قوم میں یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ غداری اور بدکرداری، دو چار دس جرنیلوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ یہ سب کے سب ایسے ہی تھے۔ حالانکہ ان بعد میں ریٹائر کئے جانے والوں میں ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جن کی دیانت و امانت، اور پاکیزگی سیرت و کردار کی قسم اٹھائی جا سکتی ہے۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں سوچا یہ گیا ہے کہ فوج کی بالائی منزل بڑی بوجھل ہو گئی ہے، اور اس میں تخفیف کی ضرورت ہے۔ اس تخفیف کے پیشِ نظر ایسے افسران کو ریٹائر کیا جانا مناسب سمجھا گیا ہے جن کی مدتِ ملازمت ختم ہو گئی تھی یا قریب الاختتام تھی۔ اگر حکومت کی پالیسی یہی ہے تو اسے قابلِ اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا، اگرچہ بحالاتِ موجودہ ہم اس قسم کے فوری اور عاجلانہ اقدامات سے متفق نہیں۔ لیکن بایں ہمہ، حکومت کو چاہیئے یہ تھا کہ جن افسروں کو محض بغرضِ تخفیف، یا ان کی مدتِ ملازمت کے اختتام کی وجہ سے ریٹائر کیا گیا ہے، اور ان کے خلاف کوئی الزام نہیں تھا، ان کی سبکدوشی کے وقت اس کا واضح الفاظ میں اعلان کر دیا جاتا۔ اس سے ایک تو قوم کے دل میں یہ غلط تاثر پیدا نہ ہوتا کہ ہماری فوج بدکردار افسروں سے بھری پڑی ہے، اور دوسری طرف خود ان افسروں کے دل کو بھی ٹھیس نہ لگتی۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ ان میں سے جو افسر ایسے تھے جنہوں نے کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے، یا جن کا دامن بددیانتی اور بدکرداری کی نجاستوں سے آلودہ نہیں تھا، ان کی تعریف کی جاتی۔ اس سے، علاوہ اسکے کہ حقدار کو اس کا حق مل جاتا، فوج میں جس قدر پاکیزہ سیرت و کردار کے افراد ہیں، ان کے حوصلے بلند ہو جاتے (سابق صدر) یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں جن ۳۰۳ افسروں کو گرفت میں لیا گیا تھا، ان میں ایسے بھی تھے جن کا دامن سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ تھا اور وہ تخریبی عناصر کی ہوسِ انتقام جوئی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس سے، خود ان افسروں کے دل پر کیا گذری تھی، اسے تو چھوڑیئے، جن دیانتدار افسروں کے خلاف کچھ نہیں کیا گیا تھا، ان کے حوصلے بھی پست ہو گئے تھے۔ ان ۳۰۳ میں بعض (خوش بخت) ایسے تھے جو تحقیقات کے بعد بری الذمہ قرار دیئے گئے لیکن ہم نے دیکھا کہ اس تہمت بیجا سے جو تیر ان کے دل پر لگا اس کا زخم آج تک مندمل نہیں ہو سکا ــــ اور یہ فطری امر ہے۔ اس نامسعود دور میں جبکہ بدقماشی اور بدکرداری وبائی مرض کی طرح عام ہو رہی ہے، جو خدا کے بندے، اپنے دامن کو اس نجاست سے آلودہ نہیں ہونے دیتے، انہیں قوم کی طرف سے اس کا صلہ، اور نہیں تو کم از کم حسنِ اعتراف کی شکل میں تو دیا جائے۔ اس سے نیک سیرتی کا عزم رکھنے والوں کے حوصلے بڑھتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ جب جماعت کے افراد اپنے واجبات ادا کرنے کے لئے سربراہِ امت، نبی اکرمؐ کی خدمت میں آتے تھے تو خدا کی طرف سے حضورؐ کو ارشاد ہوتا تھا کہ ان کے واجبات وصول کرو۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۱۰۳/۹) اور انہیں شاباش بھی دو۔ تمہاری شاباش ان کے لئے سکونِ قلب کا موجب ہوگی۔ ہم اربابِ نظم و نسق کی خدمت میں اب بھی گزارش کریں گے کہ جن افسروں کو مدتِ ملازمت ختم ہونے پر، یا بغرضِ تخفیف، ریٹائر کیا گیا ہے، اور ان کے خلاف کوئی الزام نہیں تھا، ان کے متعلق اس کی وضاحت کر دی جائے ــــ اور آئندہ بھی ایسا ہی کیا جائے۔

فوجی افسران کے علاوہ، ہم دیکھتے ہیں کہ سول کے افسروں کو بدنام کرنے کی مہم بھی عام ہو رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سول میں بدعنوانی (CORRUPTION) وبائی مرض کی طرح پھیل چکی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پوری کی پوری

سول سروس کو بدنام اور ذلیل کرنا شروع کر دیا جائے۔ ان میں جو فی الواقعہ بدعنوان اور بدکردار ہیں، انکے خلاف ایکشن لیجئے اور سخت ایکشن۔ لیکن خدا کے لئے پوری کی پوری سروس کو تو ذلیل نہ کیجئے۔ مملکت کا کاروبار فوج اور سول سروسز کے سہارے چلتا ہے۔ اگر ہم نے ان دونوں سروسز کو اس طرح ذلیل کرنا شروع کر دیا تو ملک کا خدا حافظ ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں، حکومت کے ملازمین کے لئے ایک نہایت ذلت آمیز اصطلاح وضع ہوئی تھی ـــــ یعنی نوکر شاہی ـــــ یہ اصطلاح اب بچے بچے کی زبان پر ہے اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اس سے خود سول سروس کس قدر بدنام ہو رہی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ایک طرف سے آواز اٹھتی ہے کہ فوج سے جرنیلوں کو نکال دو۔ دوسری طرف سے نعرہ بلند ہوتا ہے کہ نوکر شاہی کو ختم کر دو۔

ٹھیک ہے۔ فوج سے جرنیلوں کو نکال دو، اور سول سروس کا خاتمہ کر دو۔ اور پھر پاکستان بھارت کو ٹھیکے پر دیدو!!

(۰)

اس کے بعد ہمارے سامنے بہیئت مجموعی فوج کا سوال آتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ فوج میں تخفیف قطعاً نہیں کرنی چاہیئے ـــ نہ اوپر نہ نیچے ـــ خطرہ ہر وقت ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے اور مجھے ہوئے تجربہ کار فوجی افسر نہ کہیں سے برآمد کئے جا سکتے ہیں، نہ ایک دن میں تیار۔ اخراجات میں تخفیف مقصود ہے ـــ اور یہ ہے بھی ضروری ـــ تو ملک کے اصطبلوں میں بڑے بڑے عظیم سفید ہاتھی اور کوتل گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں ختم کیجئے۔ اخراجات میں بڑی بچت ہو جائے گی۔ فوج میں تخفیف نہ کیجئے۔ تخفیف تو ایک طرف، باقاعدہ فوج کے علاوہ عوامی فوج بھی تیار کیجئے۔ قرآنی نظام میں فوج کا الگ وجود ہی نہیں تھا۔ ہر مومن سپاہی (مجاہد) تھا۔ سول آبادی سے الگ فوج کا تصور عباسی دور حکومت میں پیدا ہوا جب ملوکیت کو ضرورت پڑی کہ عوام کو دبا کر رکھا جائے۔ جداگانہ فوج، گویا ملک کے اندر امپیریلزم پیدا کرنے کا ذریعہ تھی۔ یہی کیفیت آجتک چلی آ رہی ہے۔ فوج سے، دشمن کا مقابلہ کرنے کا کام تو کبھی کبھی لیا جاتا ہے، اسے سول آبادی کے سر پر مستقل طور پر بٹھائے رکھا جاتا ہے۔ ہمارے اس خطۂ زمین کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں اعلیٰ درجہ کی عسکری روح موجزن ہے۔ اس سے لاکھوں کی تعداد میں "عوامی فوج" تیار ہو سکتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں ملٹری ٹریننگ دی جا سکتی ہے۔ استادوں کو سول ڈیفنس کے فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ طالبات کو نرسنگ کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس طرح بلا مزید اخراجات، یا کم از کم اخراجات سے تھوڑے سے عرصہ میں، لاکھوں کی فوج تیار ہو جائے گی۔

ان تحفظاتی اقدامات کے بعد بساطِ سیاست کی طرف آیئے تو ہماری یہ رائے (جو شروع سے چلی آ رہی ہے) اب پختہ تر ہو گئی ہے کہ اول تو یہاں صوبوں کے امتیازات کو ختم کر کے پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت (ONE-UNIT) بنا دیا جائے جس میں وحدانی اندازِ حکومت قائم کیا جائے۔ صوبوں کا وجود اس کی سالمیت کے راستے میں سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یاد رکھیئے۔ جن اندرونی اور بیرونی تخریبات کی وجہ سے مشرقی پاکستان الگ ہو گیا ہے، وہی عناصر یہاں بھی کارفرما ہیں۔ اگر ہم نے انہیں علی حالہ رہنے دیا تو وہ خدشات، خطرات بن کر سامنے آ جائینگے۔ ون یونٹ کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا تھا کہ اس سے پاکستان کے دو مستقل حصوں (مشرقی اور مغربی) میں بٹ گیا ہے اگرچہ یہ اعتراض محض سطحی سا تھا، لیکن اب تو وہ شکل بھی باقی نہیں رہی۔ اب مغربی پاکستان کو ایک وحدت کی شکل میں

منضبط کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

ہمارا اتنا سا چھوٹا اور غریب ملک، پانچ پانچ اسمبلیوں (ایک مرکزی اور چار صوبائی) چار چار گورنروں، اتنی ہی تعداد میں انتظامی سربراہوں وغیرہ کے اخراجات کا متحمل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور پھر آئے دن کی کھینچا تانی اور کشمکش! یہ سب تکلفات اور دردسر کا ہے کیلئے؟ کیا یہ پورے کا پورا ملک سب کا نہیں؟ کیا ایک مرکزی اسمبلی اور ایک مرکزی حکومت سب کی مشترک نہیں ہوگی؟ کیا ہم ایک قوم نہیں؟ کیا یہ ایک مملکت نہیں؟ جب حقیقت یہی ہے تو پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے، سوائے خطرات کے اور کیا حاصل ہوگا؟ یاد رکھیئے! اس حصۂ ملک پر بھی روس، امریکہ اور بھارت تینوں کی نظریں لگ رہی ہیں اور ان کے مفادات اس کے مختلف علاقوں سے وابستہ ہیں۔ اگر اس کتابِ ملت کی شیرازہ بندی کے دھاگے کمزور ہو گئے تو یہ ورق ورق ہو جائے گی اور ان اوراق کو ہوا کے جھونکے جدھر بھی چاہیے اڑا لے جائیں گے۔

لیکن اگر اب بھی اس کا امکان نہیں تو مجوزہ آئین کی رو سے، مرکز کو زیادہ سے زیادہ مضبوط رکھا جائے اور صوبوں کو صرف وہ اختیارات تفویض کئے جائیں جن سے وہ مقامی انتظامات بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

---(•)---

یہ تو ہیں ملک کے تحفظ کے لئے ہنگامی اور عارضی (یا یوں کہئے کہ خارجی) تدبیرات۔ لیکن اس کے مستقل تحفظ اور فروغ کے لئے داخلی انقلاب لاینفک ہے۔ اور داخلی انقلاب سے ہماری مراد ہے ہماری آنے والی نسل کے قلب و دماغ میں انقلاب، جس کا واحد ذریعہ تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلی ہے۔ تعلیمی نظام کی تبدیلی کے یہ معنی نہیں کہ اس کے انتظامی امور میں کیا کیا اصلاح کی جائے۔ یہ اصلاحات جتنی اور جس قدر بھی چاہے کیجئے۔ لیکن ان سے طلباء کے نقطۂ نظر میں تبدیلی نہیں پیدا ہو سکے گی۔ یہ تبدیلی اس سے پیدا ہوگی کہ انہیں پڑھایا کیا جا رہا ہے اور جو کچھ انہیں پڑھایا جا رہا ہے وہ ان میں کس قسم کا تصورِ حیات اور مقصدِ زندگی بیدار کر رہا ہے۔ جب تک ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ اس مملکت کو ایک نظریہ کے ماتحت، ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے حاصل کیا گیا تھا، اس وقت تک ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کہ ہم اپنا نظامِ تعلیم ایسا متعین کریں جس سے ہمارے نوجوان علیٰ وجہ البصیرت سمجھ سکیں کہ وہ نظریہ زندگی اور مقصدِ حیات کیا ہے اور اس کے حصول کا طریق کیا۔ اس داخلی انقلاب کے سلسلہ میں ہم چوبیس سال سے مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں لیکن ہم اپنے ان نوجوانوں کے لئے جو دورِ حاضر کے انقلابی ممالک کے تجربہ کو اپنے لئے دلیلِ راہ گردانتے ہیں، چین کے انقلابی سربراہ ماؤزے تنگ کے خطاب کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس سے داخلی انقلاب کی اہمیت ان کے سامنے نکھر کر آ جائے گی۔ اس نے اپنی قوم کے دانشوروں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ:

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے، اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کیلئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ نقصان رساں ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد و صبر آزما، استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو آہستہ آہستہ اس تبدیلی

کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔　　　(پیکنگ ریویو - ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء)

ہمارا مسئلہ بھی آئیڈیالوجی کا ہے اور آئیڈیالوجی کے مطابق تبدیلی لانے کا طریق صحیح تعلیم و تربیت کے سوا کچھ نہیں۔

صدر مملکت مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ "وہ ایک نیا پاکستان متشکل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی قائد اعظم کے تصور کا پاکستان"۔ ان کی یہ آرزو بڑی مبارک' اور یہ عزم بڑا مسعود ہے۔ خدا انہیں اس میں کامیابی عطا کرے۔ لیکن اس کی کامیابی کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ یہ چیز دو اور دو چار کی طرح نکھر کر سامنے آجائے کہ قائد اعظم کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند صفحات آگے چل کر ایک تفصیلی مقالہ آپ کے سامنے آئے گا جو آج سے پانچ سال پہلے شائع ہوا تھا لیکن وقت کے تقاضا کے ماتحت جسے ہم دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ اس سے قائد اعظم کے تصور کے پاکستان کا نقشہ ابھر کر سامنے آجائے گا۔ اب ادھر اس پاکستان کی تشکیل، سو وہ صحیح قرآنی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ بنا بریں صدر مملکت کی خدمت میں ہماری درخواست ہے کہ وہ ایسے اقدامات بلا تاخیر عمل میں لائیں جن سے اس خطۂ زمین کے تحفظ کی طرف سے اطمینان ہو جائے' اور اس کے ساتھ' یہاں کے نظام تعلیم میں ایسی انقلاب آفریں تبدیلی کریں جس سے قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ' قائد اعظمؒ کے تصور کے پاکستان کو قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کے قابل ہو جائے۔

اگر صدر بھٹو ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو قوم ان کے پاؤں پکڑ لے گی اور زمانے کی رگِ رواں پر ان کا ثبات دوام' سورج کی کرنوں سے منقش ہوگا۔

کس قدر خوش بخت ہے وہ انسان جس کے حصے میں یہ سعادت آجائے۔

لیکن اس کے لئے بڑی گہری دیدہ وری اور خارہ شگافی کی ضرورت ہوگی۔ حکیم الامت کے الفاظ میں:

تختِ جم و دارا سرِ راہے بفروشند　　　ایں کوہ گران است' بکاہے نفروشند

باخونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

اور اس کے لئے طریق کار یہ ہے کہ

نذر دلِ آوارہ دگر بارہ باو بند　　　بر خویش کشا دیدہ واز غیر فرو بند

دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

(بقیہ ۷ ار جنوری ۱۹۷۲ء)

(بقیہ)

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ مجیب کا مسئلہ پھر ابھر کر سامنے آگیا۔ ہم نے صفحہ (کے حاشیہ میں) لکھا ہے کہ مجیب نے کہا تھا کہ اگر بھٹو نے میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کی تو میں مغربی پاکستان پر بھی قبضہ کر لوں گا اور سارے ملک کا وزیر اعظم بن جاؤں گا۔ مسٹر بھٹو نے اس کے جواب میں کہا کہ بسم اللہ۔ تشریف لایئے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ۔۔ اگر مجیب اس پیشکش کو قبول کرنے تو میں اس کے لئے صدارت، وزارت تو ایک طرف سیاست تک سے بھی دست بردار ہو جانے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر مجیب نے اپنے بیان کی تردید کر دی ہے اور کہا ہے کہ مسٹر بھٹو کی یہ پیشکش مضحکہ انگیز ہے۔ اس نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مسٹر بھٹو نے دو دفعہ اس کی جان بچائی ورنہ یحییٰ خان نے اس کے لئے پھانسی کا پھندا تیار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود مجیب کی دناءت کا یہ عالم ہے کہ صدر بھٹو کو مخاطب کرتے وقت ذرا سی شرافت سے بھی کام نہیں لیتا۔ اس کے برعکس مسٹر بھٹو نے یہ پیشکش بھی کی ہے کہ اگر مشرقی پاکستان کو ضرورت ہو تو ہم وہاں سے گندم اور چاول بھیجے

کے لئے تیار ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہاں کا انتظام درست کرنے کے لئے سول اور فوج کے افسر بھی — حالانکہ مجیب اُن افسروں کے خلاف جو اس وقت اُس کے قبضے میں ہیں جنگی مجرموں کی حیثیت سے مقدمات چلانا چاہتا ہے۔ وہ (سابق گورنر) محترم عبدالمالک اور ان کی کابینہ کے بعض وزراء کو اس مقصد کے لئے بھارت کی تحویل سے نکال کر اپنے قبضے میں لے چکا ہے۔ مجیب نے کہا کہ جو ارباب اقتدار مشرقی پاکستان میں قتل و غارت گری کے ذمہ دار ہیں ان پر مقدمات چلائے جائیں۔ اس کے جواب میں مسٹر بھٹو نے کہا کہ ہم نے ایسے دو جرنیلوں کو قید کر لیا ہے۔ اگر مجیب صاحب اور نام بھیج دیں تو ہم انہیں بھی قید کر دیں گے۔ بھارت جنگی قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ وہ ان کے سروں کی قیمت پر ہم سے سودے بازی کرنے کی سوچ رہا ہے۔ مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ میں ان کے بدلے میں اپنے بیٹے کو بطور یرغمال انڈیا بھیجنے کے لئے تیار ہوں — اس وقت مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ ان کے گھر بار تباہ کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی (یعنی خود ہماری) بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لٹ چکی ہیں۔ ان پر زمین تنگ ہو رہی ہے۔ آسمان تنگ ہو رہا ہے۔ کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچ رہا — وہاں یہ ہو رہا ہے اور مجیب دہائی دے رہا ہے کہ مغربی پاکستان کی فوج نے تیس لاکھ بنگالیوں کو قتل کر دیا ہے۔ ان کا خون بہا ضرور لیا جائے گا۔ وہ ان کا خون بہا مانگ رہا ہے اور ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان پر بیرونی اقوام کے جس قدر قرضے ہیں وہ سب کے سب مغربی پاکستان ادا کریگا۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ بھارت، ہم سے تاوانِ جنگ وصول کرنے کی بھی سوچ رہا ہے اور ہمارے جو جنگی قیدی اس کے قبضے میں ہیں جب وہ رہا ہوں گے تو وہ ان کے اخراجات بھی ہم سے وصول کریگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ وہ مغربی پاکستان کی سرحدوں سے اپنی فوجوں کو اس وقت تک پیچھے لے جانے کے لئے تیار نہیں جب تک سرحدوں کی نئی حد بندی نہیں کی جاتی۔

بھارت اور اس کے شطرنج کے مہرہ مجیب کا یہ طرز عمل ہے اور پاکستان میں ایک طبقہ ایسا ہے جو شور مچا رہا ہے کہ مجیب بڑا محب وطن ہے اس کے خلاف لب کشائی مت کرو۔ اس کی منت خوشامد کرو کہ وہ جن شرائط پر چاہے پورے کے پورے پاکستان کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ہم نہایت دیانتداری سے اعتراف کرتے ہیں کہ مجیب کا معمہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس شخص کے متعلق ہم ایک سال (بلکہ ۱۹۶۶ء سے جب اس نے اپنے چھ نکات پیش کئے تھے) اپنے خیالات ملک کے سامنے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور انہی کو ہم نے سابقہ صفحات میں بھی دہرایا ہے۔ یہ خیالات تنہا ہمارے نہیں۔ ملک کی اکثریت کے خیالات ایسے ہی ہیں۔ وہ اس شخص کو پہلے درجے کا غدار، سازشی اور پاکستان کا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف سے آوازیں اٹھتی ہیں کہ وہ بڑا محب وطن اور پاکستان کا بہی خواہ ہے۔ قرآن کریم نے جماعت مومنین سے کہا تھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم غدارانِ قوم (منافقین) کے متعلق دو آراء رکھ رہے ہو؟ یعنی قرآن کے نزدیک ایسے اشخاص کے سلسلہ میں قوم کا دو مختلف الخیال گروہوں میں بٹ جانا بڑے خطرے کا موجب ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت قوم اس خطرے سے دوچار ہو رہی ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ قوم کو مجیب کی اصلیت اور حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ ہم حکومت سے

ایک اہم مطالبہ | مطالبہ کریں گے کہ جس ٹریبونل نے مجیب کے مقدمہ کی تفتیش کی تھی اس کی رپورٹ شائع کی جائے

تاکہ قوم اس کے متعلق صحیح صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ نہایت ضروری ہے ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ملک میں تنازعہ کا باعث نہ بن جائے۔ قوم کو تاریکی میں رکھنے سے ہم جس قدر ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا چکے ہیں، وہی کچھ کم نہیں جو اس میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے۔ قوم بُری طرح پٹ چکی ہے۔ خدا کے لئے اسے اب تاریکی میں نہ رکھیئے۔ اس رپورٹ کو جلد شائع کر دیجیے۔

(٠)

ہماری موجودہ شکست نے، ملک کے تخریبی عناصر کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ایک نیا موقعہ بہم پہنچا دیا ہے۔ یہ وہ گروہ ہیں جو شروع سے پاکستان کے مخالف تھے اور جنہوں نے اس کی تخریب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان میں ایک گروہ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے عقیدتمندوں کا ہے۔ (مولانا) آزاد نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں (اپنی کتاب 'انڈیا ونز فریڈم' میں) کہا تھا کہ مذہب کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم اور ایک مملکت بنانے کا خیال فریب ہے۔ اسلام نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تھوڑے سے عرصے کے تجربہ نے بتا دیا کہ یہ ناممکن ہے۔ اب پاکستان کے حامی اسی ناکام تجربہ کو پھر دہرا رہے ہیں اور مشرقی اور مغربی پاکستان کو، زبان، نسل، جغرافیائی بُعد کے باوجود محض اشتراکِ مذہب کی بنا پر ایک مملکت قرار دے رہے ہیں۔ دیکھ لینا۔ یہ تجربہ بھی ناکام رہے گا۔ — حالیہ سانحہ کے بعد، یہ گروہ اب سرگوشیاں کر رہا ہے کہ تم نے دیکھا! جو کچھ مولانا صاحب نے فرمایا تھا کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہوا! انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ خود مغربی پاکستان کے مختلف صوبے بھی محض مذہب کے اشتراک کی بنا پر ایک مملکت نہیں بن سکیں گے — تم دیکھ لینا کہ ان کا یہ خیال بھی صحیح ثابت ہوگا۔ لہٰذا اس خیالِ خام پر مُصر رہنے سے کیا حاصل؟ یہ گروہ ویسے تو اپنے آپ کو (مولانا) آزاد کا عقیدتمند ظاہر کرتا ہے لیکن درحقیقت ہے روس نواز۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ زبان، رنگ، نسل، وطن، بُعدِ مسافت کے باوجود محض معاشی نظریہ کے اشتراک کی بنا پر اپنا رشتہ ماسکو کے ساتھ جوڑتے ہیں، لیکن یہی بات اگر اسلام کے متعلق کہی جائے تو اسے حماقت قرار دیتے ہیں!! ہم ان معترضین سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ملک کا نظامِ تعلیم قرآنی پروگرام کے مطابق کر دو اور مذہبی پیشوائیت کو اس میں دخل نہ دینے دو۔ پھر دیکھو کہ یہ افراد رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اختلافات کے باوجود چند ہی سالوں میں کس طرح ملتِ واحدہ نہیں بن جاتے! لیکن ان کا مقصد تو محض تخریب ہے۔

دوسرا گروہ اپنے انداز میں سرگوشیوں میں مصروف ہے۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے۔" یہ گروہ کہتا ہے کہ تم نے چوبیس سال تک تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ یہ ملک اسلامی بن نہیں سکا۔ اب مولانا صاحب کا فارمولا آزما کر دیکھ لو۔ اس ذرا سے کونے میں سمٹ کر بیٹھ جاتے اور ہر وقت ڈرے، سہمے ہوئے رہنے کے بجائے، پورے ہندوستان میں پھیل جاؤ۔ اور اسے (سارے کے سارے کو) پاکستان بنا ڈالو۔ ہم ان حضرات سے مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے۔ مودودی صاحب سے پوچھیے کہ وہ ہندوستان جا کر اپنے نسخے کو کیوں نہیں آزما لیتے۔ اب بھی وہاں تشریف لے جائیں اور سارے ہندوستان کو پاکستان بنا ڈالیں! انہیں کون روکتا ہے؟

یہ ہیں پاکستان کے "ناصحینِ مشفقین" جو اس حادثہ فاجعہ پر اس طرح اپنے حسد و انتقام کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔

اور ملک میں بددلی اور افسردگی پھیلانے میں مصروف ہیں — اور یہ ہیں وہ حالات جن میں مسٹر بھٹو نے اس بارِ امانت کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

نہ آسماں بگردش و ما درمیانہ ایم
غالبؔ دگر بپرس کہ برما چہ می رود

ان حالات میں اس ملک کے بچنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ مسٹر بھٹو پر اعتماد کیا جائے، اس کے ساتھ تعاون کیا جائے اور اسے کچھ وقت دیا جائے کہ وہ ان بکھرے ہوئے تنکوں کو یکجا کر سکے — کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است۔ اس کے ساتھ ہی ہم مسٹر بھٹو سے یہ عرض کریں گے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) برائیاں مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ بھلائیاں زیادہ سے زیادہ عام کر دی جائیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مہم تنہا ان کی پارٹی کے ارکان سے سر نہیں ہو سکے گی۔ یہ پارٹی بنائی نہیں گئی تھی، حالات کے دباؤ سے یونہی بن گئی تھی۔ اس لئے اس میں بیشتر عنصر ایسا ہے جو ناتجربہ کار بھی ہے اور جن کی سیرت و کردار پر عوام کو بھروسا بھی نہیں۔ اس لئے اسے چاہیئے کہ اپنی پارٹی کے ایسے ارکان سے کہہ دے کہ

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی   اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اور ملک کے ایسے افراد کو اپنا شریکِ کار بنائے جو پختہ کار ہوں، ٹھنڈے دل و دماغ کے ہوں، پاکستان اور اسلام کے ساتھ جن کی وفاشعاری مسلّم ہو، جن کی سیرت شک و شبہ سے بالا ہو اور جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہ ہو۔ قوم میں ایسے افراد کی کمی نہیں۔ نگاہ اور تلاش شرط ہے۔ مسٹر بھٹو کو اس قسم کے مشیروں کی ضرورت ہے۔ جب قرآن کریم نے پروگرام کی کامیابی کیلئے محمد رسول اللہ جیسی عظیم ہستی کے ساتھ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (ان کے رفقاء) کی شرط لازم قرار دی تھی، تو دنیا میں کونسا فرد ایسا ہو سکتا ہے جو اَلَّذِيْنَ مَعَهٗ (رفقاء) سے بے نیاز ہو کر کامیابی حاصل کر سکے۔ اَلَّذِيْنَ مَعَهٗ (اپنے ساتھیوں) کا انتخاب کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ اور مسٹر بھٹو کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے۔

———(۰)———

مسٹر بھٹو نے اپنی (ملتان کی) تقریر میں کہا ہے کہ انہوں نے اخبارات پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھا دی ہے اور پریس کو آزادی دیدی گئی ہے کہ وہ جو جی چاہے کہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ قومی مفاد کی حدود سے بھی تجاوز کر جائیں۔ "ساری الجھن اس آخری ٹکڑے سے پیدا ہوتی ہے۔ کہنے اور لکھنے والا آزادی کے تصور کے ماتحت کچھ کہہ جاتا ہے اور اس بات کا انکشاف کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ "قومی مفاد" کی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، اس پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا پاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ "قومی مفاد کی حدود" کا تعین وضاحت سے کر دیا جائے جس طرح ایک مسلمان کو اس کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ وہ مسلمان کہلاتا ہوا یہ کہتا پھرے کہ خدا کی ہستی محض ایک واہمہ ہے اور وحی کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح ایک پاکستانی کو اس کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ وہ مملکتِ پاکستان کی اساسات کے خلاف کچھ کہے یا لکھے۔ مثلاً — (۱) نظریۂ پاکستان کے خلاف۔ لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ خود نظریۂ پاکستان کے مفہوم کا تعین کیا جائے۔ اس سے آج تک گریز کیا جا رہا ہے۔

(۲) پاکستان کی سالمیت کے خلاف:۔ سالمیت کے معنی یہ ہیں کہ مملکتِ پاکستان ایک آزاد، خود مختار وحدت ہے جس کے اقتدارِ مطلق (SOVEREIGNTY) کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا اور جس کا کسی دوسری مملکت کے ساتھ نہ وفاق (فیڈریشن) ہے نہ معاہداتی (کنفیڈریشن)۔

(۳) مرکز کے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مملکت کے کلی اختیارات مرکز کی تحویل میں ہوتے ہیں اور وہ ان میں سے کچھ اختیارات صوبوں کو تفویض (DELEGATE) کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے "صوبائی خود مختاری" کی اصطلاح ہی غلط اور باغیانہ ہے۔ کوئی صوبہ خود مختار ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی "خود مختاری" کا اگلا قدم "علیحدگی" کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ہمیں پہلے بھی اس سلسلہ میں محتاط رہنے کی ضرورت تھی لیکن اب تو اس کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ایک جرمن اخبار نے کیا لکھا ہے؟ اس نے لکھا ہے کہ حالیہ جنگ کے دوران انڈیا نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا — اب سندھ، فرنٹیئر کی باری ہے۔ اگر ہم اس کے بعد بھی صوبائی خود مختاری کے خطرہ کو محسوس نہیں کرتے تو ہمارا خدا حافظ!

یہ اور اسی قسم کی دیگر اساسی شقوں کی وضاحت کر لی جانی چاہیئے اور انہیں آئینِ پاکستان میں درج کر کے ان کی خلاف ورزی کو خلافِ قانون اور جرمِ بغاوت کے مرادف قرار دینا چاہیئے۔ اس طرح صحیح آزادی اور پابندی کی حدود متعین ہو سکیں گی۔ اس کے بغیر یہ بیان جوانی سطح کی "آزادی" ہو گی جسے علامہ اقبال نے "ابلیس کی ایجاد" قرار دیا ہے اور یہ غلامی کی شکل جس کا ردِ عمل کوہِ آتش فشاں کے لاوا کا سیلاب ہوتا ہے۔ (رقیہ ۲۲ جنوری ۷۲ء)

═══ (بقیہ) ═══

حقائق و عبر

۱۔ ملعون خوشامد کی انتہا

جو قوم اخلاص و صداقت سے عاری ہو جاتی ہے اس میں جرأت و بیباکی کے جوہر باقی نہیں رہتے وہ انتہا درجہ کی خوشامد پسند ہو جاتی ہے۔ اس خوشامد پسندی کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص برسرِ اقتدار رہتا ہے اس کی مدح و ستائش میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں، لیکن جونہی وہ اس کرسی سے نیچے اترتا ہے اسے دنیا کا بدترین انسان بنایا جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بدکردار کی برائیوں سے پردہ نہ اٹھایا جائے۔ اٹھایا جائے اور ضرور اٹھایا جائے۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ اگر یہی پردہ اس وقت اٹھایا جائے جب وہ برسرِ اقتدار تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم قوم اس کی بدکرداریوں کے تباہ کن انجام سے محفوظ ہو جائے۔ لیکن ہمارے ہاں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہر چڑھتے سورج کو سلام کیا جائے گا اور غروب ہونے کے بعد اس پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی اخبارات اور ادارے جو کل تک یحییٰ خان کو عالم پناہ اور عزت مآب قرار دے رہے تھے آج اس کی فحاشیوں اور عیاشیوں کی داستانوں کو کس طرح مزے لے لے کر بیان کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس مردود ازلی کی یہ کرتوتیں اس کی معزولی کے بعد شروع نہیں ہوئیں۔ وہ برسہا برس سے اسی قماش کا چلا آ رہا تھا۔ اور یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کا انہیں علم نہ ہو۔ لیکن اس وقت کسی نے ایک لفظ بھی اس کے خلاف نہ کہا۔ یہی نہیں کہ اس کے خلاف کچھ نہ کہا بلکہ معلوم اسے کیا کیا قرار دیا۔ اس کے متعلق یہاں تک کہا گیا کہ:

> مجھے قوی امید ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا جو سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے منقطع ہوا تھا اس کی بحالی کا آغاز انشاء اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین سے ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خان صاحب کو عزم و ہمت اور اس اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کا انہوں نے بار بار اپنی تقریروں میں ذکر فرمایا ہے۔ آمین!

آپ کو معلوم ہے کہ اس مجسمہ عفونت کو جس کے روئیں روئیں سے بدبوئے فسق کے بھبکے نکل رہے ہیں حضرت علیؓ کا عاشق اور

اس سلسلۂ رشد و ہدایت کا احیاء کرنے والا جو ان کی ذات والا صفات پر منقطع ہو گیا تھا، قرار دینے والا کون ہے؟ سنئے اور غور سے سنئے! یہ بزرگوار ہیں، پاکستان میں اقامتِ دین کی واحد علمبردار جماعت — جماعت اسلامی — کے (قائمقام) امیر، میاں طفیل محمد صاحب، جنہوں نے یہ ارشادات، اپنی جماعت کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ۸ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو ارزانی فرمائے اور جو جماعت کے ترجمان "ایشیا" کی ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت کے صفحہ ۶ پر شائع ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس جماعت کے اس ممدوح کا انجام جس قدر عبرت آموز ہے سو ہے، لیکن اس جماعت کا مآل اس سے بھی زیادہ عبرت آموز اور ذلت آمیز ہے۔ وہ تملق پیشگی میں اس انتہا تک پہنچ گئے لیکن اس کے باوجود انہیں بھیک کا ایک ٹکڑہ تک نہ مل سکا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس جماعت نے حضور رسالتمآبؐ کی ذات اقدس و اعظم اور صحابہ کبارؓ کی شان میں جو گستاخیاں کی ہیں — اور جس کی آخری کڑی یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کے بدکردار شخص کو حضورؐ کے ایک ایسے جلیل القدر صحابیؓ کا عاشق اور انؓ کے مسلک کا محی قرار دیا — اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی عاقبت تو جو خراب ہوتی تھی وہ ہوئی، انہیں دنیا میں اس قدر ذلت نصیب ہو رہی ہے — ایسی ایسی جلیل القدر ہستیوں کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو، خدا کے قانونِ مکافات کی غیرت کبھی معاف نہیں کیا کرتی!

(٭)

۲۔ غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را

مجیب نے قلمدانِ وزارت عظمیٰ سنبھالنے کے بعد پہلا ارشاد یہ فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے سابقہ حکومت کے ساتھ تعاون کیا تھا، انہیں عبرت آموز سزائیں دی جائیں گی۔

بیچارے سرکاری ملازمین کی بے بسی قابلِ رحم ہے۔ ہر حکومت یہ تقاضا کرتی ہے کہ سرکاری ملازمین اسکے ساتھ تعاون کریں اور انہیں اسکے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب اس حکومت کی جگہ دوسری حکومت آجاتی ہے تو سابقہ حکومت کیساتھ ان کا تعاون اور وفاداری جدید حکومت کے نزدیک سب سے بڑا جرم قرار پا جاتے ہیں — یعنی اگر وہ موجودہ حکومت سے تعاون نہ کریں تو ان کے ہاتھوں سزا پائیں اور اگر ان سے تعاون کریں تو نئی حکومت کے ہاتھوں پٹیں۔

اور تماشا یہ کہ ہر نئی حکومت، سابقہ حکومت کے ساتھ ان کی وفاداری اور تعاون کو مستوجب سزا بھی قرار دیتی ہے اور ان سے اپنی وفاداری اور تعاون کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔

یہ ہے وہ عذاب جس میں سرکاری ملازم آئے دن بدلنے والی حکومتوں کے دور میں عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر نئی حکومت کے ہاتھوں اپنے مستقبل کے متعلق خدشات کی پیدا کردہ یہی وہ بے اطمینانی (SENSE OF INSECURITY) ہے جس کی وجہ سے وہ سوچتا یہ ہے کہ جب تک یہ حکومت قائم ہے جائز و ناجائز طریق سے جس قدر سمیٹا جا سکتا ہے سمیٹ لو معلوم نہیں کب اس حکومت کا تختہ الٹ جائے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا بھی بوریہ بستر بندھ جائے۔ انگریز کے دورِ حکومت میں جو بدعنوانیاں اسقدر عام نہیں تھیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کیطرف سے کلی اطمینان ہوتا تھا۔

(٭)

۳۔ اور دوسری وجہ

یہ سوال ہر شخص کے دل سے ابھرتا اور لب پر آرہا ہے کہ سرکاری ملازمین کی ان بدعنوانیوں کا کچھ علاج بھی ہے؟ سوال

بڑا اہم اور غور طلب ہے لیکن اس کا جواب بادی النظر میں سامنے آسکتا ہے۔

کوئی سرکاری ملازم نہ پیدائشی بدکردار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بدعنوانیاں کرنے کے لئے ملازمت اختیار کرتا ہے جب وہ ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے کچھ قاعدے اور قانون بتائے جاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اسے ان کے مطابق خود کام کرنا اور دوسروں کے معاملات کے فیصلے کرنے ہونگے۔ وہ ان کے مطابق عملدرآمد کرتا ہے کہ ایک دن ارکان حکومت میں سے ایک صاحب جس کا وہ براہ راست ماتحت ہوتا ہے، اسے بلا کر کہتے ہیں کہ اس معاملہ کا فیصلہ یوں کیا جائے۔ یعنی قانون اور قاعدے کے خلاف اور ان کی منشا کے مطابق — ایسا جری اور بیباک تو کوئی نکلتا ہے جو ایسے حکم کی تعمیل سے انکار کرکے اسکا خمیازہ بھگتنے کیلئے تیار ہو جائے۔ عام حالات میں اسے اپنی ملازمت برقرار رکھنے کیلئے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایسا کر دیتا ہے اور اسکے بعد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس لاقانونیت سے ان صاحب نے کسقدر فائدہ حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد اسکی روش یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ایک کام ان صاحب کیخاطر خلاف قانون کرتا ہے تو دو کام اپنے مفاد کی خاطر خلاف قانون کرتا ہے۔ اور پھر چل سو چل — وہ بڑے صاحب یہ سب خود دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن اسے کچھ کہہ نہیں سکتے کہ ایسا کہنے سے وہ اس سے اپنے خلاف قانون کام کس طرح کرائیں؟

یہ ہے (CORRUPTION) کا بنیادی سبب۔ اور اسکا علاج ارکان حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ کسی افسر ماتحت سے اپنے لئے خلاف قانون کام نہ کرائیں تو وہ کبھی کوئی کام بھی خلاف قانون نہیں کریگا اور اگر کبھی ایسا کریگا تو اس کا فوراً مواخذہ ہو جائیگا۔ کیا آپنے نہیں دیکھا کہ جب بھی کسی بدعنوان افسر کیخلاف تحقیقات کی جاتی ہے تو اس کی خلاف قانون کارروائیوں پر سرفہرست وہ کام ہوتے ہیں جو اس سے خود ارکان حکومت نے کرائے تھے۔

یہ ہے بدعنوانیاں بند کرنے کا طریق! آپ جس شعبہ میں بھی بدعنوانیاں دیکھیں تحقیق پر معلوم ہوگا کہ اس سے متعلقہ رکن حکومت بدعنوان ہے یا نالائق، لہٰذا برطرف — اور نالائق رکن حکومت کا تقرر خود سب سے بڑی بدعنوانی اور قانون شکنی ہے۔

(۰)

۴۔ جمہوری تماشا

یورپ نے جمہوری مشینری کا جھنجھنا دیکر اقوام عالم کو عجیب قسم کا "اضحوکہ" بنا رکھا ہے جمہوریت کے متعلق فریب یہ دیا جاتا ہے کہ اس میں اقتدار اور اختیار عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے حالانکہ یہ اختیار اس وقت تک ہوتا ہے جب تک ووٹ کی پرچی اس شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جونہی اس نے وہ پرچی ڈبے میں ڈالی اس کے اختیار و اقتدار کی حدود ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد کامل اختیار و اقتدار اسکے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جو ان پرچیوں کی رو سے منتخب ہو جاتا ہے۔ یہ منتخب ہونیوالا دوسرے الیکشن تک اسی قسم کا آمر ہوتا ہے جیسے دنیا کے اور ڈکٹیٹر۔ البتہ اسے ظاہر یہ کرنا پڑتا ہے کہ اقتدار اور اختیار اس کے ہاتھ میں نہیں عوام کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے وہ عوام کو یقین دلاتا ہے کہ وہ انہیں تمام حالات سے باخبر رکھے گا اور ان کی منشا اور منظوری کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں نہ ممکن ہوتی ہیں اور نہ ہی قرین مصلحت۔ ایک سربراہ مملکت یا دیگر ارکان حکومت رموز مملکت کا قبل از وقت انکشاف کر ہی نہیں سکتے حکومت سے متعلق سینکڑوں باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں صیغہ راز میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلئے وہ عوام کو نہیں بتلائی جا سکتیں۔ جہاں تک عوام کی منظوری سے قدم اٹھانے کا تعلق ہے یہ بھی ناممکن ہے اسلئے کہ آپ ہر معاملے میں ریفرنڈم (استصواب رائے) کرا نہیں سکتے۔ اور جب ایسا کیا جانا ممکن نہیں تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ ہر بات کا فیصلہ عوام کی منشا کے مطابق کرینگے۔ دراصل ایک منتخب شدہ لیڈر کے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کردار اور اطوار سے عوام کا مکمل اعتماد حاصل کرلے۔ جب اسے

ایسا اعتماد حاصل ہو جائے تو پھر عوام میں سے کوئی بھی نہیں کہے گا کہ تم نے فلاں بات ہمیں کیوں نہیں بتائی اور فلاں فیصلہ ہم سے پوچھ کر کیوں نہیں کیا۔ بس یہی ایک حقیقت ہے اور عوام کے اقتدار اور اختیار کے دعاوی سب افسانے ہیں۔ لیکن اسکا کیا علاج کہ ذہنِ انسانی کا بچپن حقیقت کے بجائے افسانوں کو زیادہ پسند کرتا ہے اور منتخب شدہ لیڈر اسکا فائدہ اٹھاتا رہتا ہے لیکن اتنا نہیں سوچتا کہ جب وہ ان غلط دعووں کو پورا نہیں کرتا جو اس نے عوام کو بہلانے کی خاطر کئے تھے تو وہ ان کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ عوام تو کسی "پختہ کار کا غلام" بننے میں بھی عار نہیں سمجھتے بشرطیکہ وہ پختہ کار صاحبِ کردار ہو۔

۵۔ خدا کے لئے کچھ کیجئے

اگر آپ اپنا کلیجہ تھام سکتے ہیں تو اس خبر کو پڑھیئے:۔

"لندن ۵ ارجنوری، نمائندہ بی بی سی نے ڈھاکہ سے اطلاع دی ہے کہ اگرچہ شیخ مجیب بھی عوام سے اپیل کر چکے ہیں کہ غلیتوں پر مظالم نہ ڈھائے جائیں لیکن ابھی تک اس اپیل پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہر روز بہت سے افراد کا نام سنا جا رہا ہے جو پاکستانی پولیس سے تعلق رکھتے تھے تاجر تھے اور اب ان پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے نسل کشی کی مہم میں پاکستان کی امداد کی ہے۔ نمائندہ مذکور کے مطابق غیر بنگالی آبادی میں سخت خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے خاص طور پر بہاری عوام سخت خلفشار کی حالت میں ہیں۔ انکی آبادی ۱۰ لاکھ سے کم نہیں انہوں نے بھارتی افسروں سے درخواست کی تھی کہ انہیں بھارت بھیج دیا جائے لیکن یہ درخواست قبول نہیں کی گئی۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ انہیں مغربی پاکستان بھیج دیا جائے لیکن اسکا کوئی امکان نہیں کیونکہ کوئی شخص اس کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں۔ نامہ نگار نے بتایا کہ میں نے بہاری آبادی میں گھومنے پھرنے کی کوشش کی لیکن مجھے روک دیا گیا میں صرف چند لوگوں سے بات کر سکا ہوں۔ ایک بڑھیا نے مجھے بتایا کہ میرے جوان بیٹے کو میری آنکھوں کے سامنے بندوق کے کندے مار مار کر ہلاک کیا گیا میری جوان بیٹی کو اٹھا لے گئے اور میرے مکان کو لوٹ لیا گیا۔ اب میں اس جھونپڑی میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک بوڑھے نے اشکبار ہو کر مجھے بتایا کہ میرے سارے اقارب کو تہ تیغ کیا جا چکا ہے۔ کاش مجھے بھی زندہ نہ چھوڑتے میں دکان سے محروم ہو چکا ہوں اور میرا مکان لٹ چکا ہے۔" (نوائے وقت۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۲ء)

اس میں شبہ نہیں کہ ہم خود جن حالات سے گزر رہے ہیں انکی مجبوری کی وجہ سے ہم اپنے ان بےکس مظلوم بھائیوں کے لئے براہ راست کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اس قوت سے محروم ہیں جو ظالم کی کلائی مروڑ کر اسے عدل پر جھکا دے۔ لیکن ہم آہ و نالہ تو کر سکتے ہیں۔ شور و فغاں تو کر سکتے ہیں۔ شیون و فریاد تو کر سکتے ہیں۔ خدا کے لئے اتنا ہی کیجئے۔ یو۔ این۔ او کے سیکرٹری جنرل، سیکورٹی کونسل کے صدر، اور پریذیڈنٹ نکسن کو تاریں دیجئے۔ ہزاروں کی تعداد میں تاریں دیجئے۔ شور مچائیے۔ شاید اس سے ہم ضمیر اقوام کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر مشرقی پاکستان کے لئے سلسلۂ مواصلات قائم ہو جائے تو مجیب کو بھی تاریں دیجئے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ انتہائی کینہ توز ہے۔ اس لئے اس سے کسی جذبۂ انسانیت کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن اس سے ہم اتمامِ حجت تو کر سکیں گے۔ دنیا کو بتا تو سکیں گے کہ ہم نے اس کی جنت کا دروازہ بھی کھٹکھٹا دیکھا ہے — یہ کیجئے اور خدا کے لئے جلدی کیجئے شاید ہم ان لاکھوں میں سے کچھ ہی کو بچا سکیں۔ سندھ کے ساحل سے ایک مظلوم لڑکی نے فریاد کی تھی تو خلیفۂ بغداد نے اس کی مدد کے لئے ایک لشکر بھیج دیا تھا۔ کیا ہم اپنی ان چادر دریدہ بہنوں اور بیٹیوں کی آہ و فغاں پر اتنا بھی نہیں کر سکتے!

(×)

قائداعظمؒ کے تصوّر کا پاکستان

"ہم ایک نیا پاکستان بنانا چاہتے ہیں ـــ قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان" (صدر بھٹو)

[اس وقت مملکتِ پاکستان کی فضا جن یاس انگیز تاریکیوں کی چادر میں ملفوف ہے، ان میں امید کی ایک ہلکی سی کرن ابھری ہے۔ یہ شعاعِ امید ہے مملکت کے جواں سال صدر مسٹر بھٹو کا یہ اعلان کہ ہم ایک نیا پاکستان بنانا چاہتے ہیں ـــ قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان ـــ اس نشیدِ جانفزا کے بعد ہمیں قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ ہم واضح خطوط سے بتائیں کہ قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان کیا تھا۔ وہ کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ اگر ان کے تصور کے مطابق پاکستان متشکل ہو جاتا تو وہ کیسا ہوتا؟ ہم سے اگر یہ تقاضا نہ بھی کیا جاتا تو بھی ہم اسے اپنا فریضہ سمجھتے کہ یہ بتائیں کہ قائداعظمؒ کے پیشِ نظر پاکستان کا تصور کیا تھا۔ یہ اس لئے کہ طلوعِ اسلام کو یہ فخر اور سعادت حاصل ہے کہ یہ پہلے دن سے قائداعظمؒ کے پیغام کا نقیب رہا ہے اور گزشتہ تیس پینتیس برس سے مسلسل اس پیغام کو دہراتے چلا جا رہا ہے، اس لئے کہ یہ پیغام درحقیقت قرآن کریم ہی کی تعلیم پر مبنی پیغام ہے۔ اس مرکزی موضوع پر طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات پر اس شرح و بسط اور اس تکرار و اصرار سے لکھا جا چکا ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس مقصد کے لئے ہم نے اس کی اوراق گردانی کی تو ہمارے سامنے وہ خطاب آیا جسے پرویز صاحب نے آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب پر بندرِ سامعین کیا تھا۔ اور جس کا عنوان تھا ـــ قرآنی پاکستان کیسا ہوتا ـــ اس خطاب کو پیشِ خدمت قارئین کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قائداعظمؒ کے تصور کا وہ "نیا پاکستان" جس کی تعمیر کا وعدہ صدر بھٹو نے کیا ہے، کس نہج کا ہونا چاہیئے۔ صدر بھٹو کا یہ اعلان درحقیقت علامہ اقبالؒ کے اس پیغام کی صدائے بازگشت ہے جس میں انہوں نے (شاید ایسے ہی حالات کے پیشِ نظر جن سے اس وقت ہم دوچار ہیں) کہا تھا کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اگر صدر بھٹو کے عزم بلند کے تصدق قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان وجود میں آجائے تو وہ ہمارے رقیب کی حالیہ محدودیت کا کفارہ اور ہمارے مقدر کی ظلمت آمیز فضا کا درخشندہ ستارہ بن جائیگا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔]

(۱۰)

اسلام ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کیطرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں اور اس کا اصل الاصول امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصورِ اسلام کی رُو سے اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان، بایں ہمہ بے بسی و بے کسی انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا اہتمام کرینگے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر، ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کے لئے استخلاف فی الارض ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو — یَعْبُدُوْنَنِیْ۔ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا۔ (۲۴/۵۵) جب رسول اللہ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملیگا؟ آپ نے فرمایا کہ جنت، یعنی باغ و بہار آخرت — ہمیشہ رہنے والی زندگی — اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ — نعم النصر و التمکین فی البلاد۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا، جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکیگا اور انہیں عصرِ حاضر کی رو کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبۂ الٰہ آباد۔ ۱۹۳۰ء)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ:

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات

کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ ان قوانین کا از خود، بطیبِ خاطر، اتباع کرتے جائیں[1]۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا ...... نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

> اسلام تخت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (خطبات)

اور قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا کہ:

> اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ (کسی اور شخص یا ادارہ کی)۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجہ جواز۔ اور یہی وہ بنیاد جس پر مطالبہ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

~~~~~~(م)~~~~~~

لوحِ سادہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجہ نزاع اور سب سے شدید سببِ تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظام نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ — اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۳) ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ان سے اس کے جواب میں کہا جاتا کہ — اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ۔ (۴۳/۲۴) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباء و اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی

---

[1] اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔
~~~~~~

اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دوگے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظام (نو) کی ضرورت نہیں ــــ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ (۵/۱۰۴) وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے۔
یہی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلکِ آبا کی۔ اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا ہے اس لئے رسول اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکلنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، ان تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر ــــ لاالٰہ الّا اللہ ــــ ہے۔ اس میں لاالٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے، ہر شے کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر، اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الّا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اَوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا ــــ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دیدی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے ــــ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آگئی چنانچہ، وائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ:

بُت پرستی کی کنہ درحقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے [۱]

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات

---

[۱] A. N. WHITEHEAD — ADVENTURE OF IDEAS — P.12

سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

> زندگی کے بیجان پیکر دل کیساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے۔ اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی اِن برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھیے، جوہرِ زندگی کی نمود اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں تو یہ انسانی زندگی میں نشو و ارتقار کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔ یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبالؒ کہتا ہے کہ :-

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کارے نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآنِ کریم نے جس کا جشنِ نزول منانے کے لئے ہم آج جمع ہوئے ہیں، اپنا تعارف کراتے یا یوں کہیئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ — اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ (۹۷/۱) یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ اُن نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو، جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے، ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ

> اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

روشِ کہن

ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔

اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت، طریقت، تصوف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد، ان "بتانِ عجم" کو حرمِ کعبہ سے نکال کر اسے خالصتہً خدا کے گھر میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیکر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت

"بتانِ عجم" کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ؎

حکایتِ قدِ آں یار دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ دو دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوحِ سادہ (CLEAN SLATE) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملتِ پاکستانیہ حضور نبی اکرمؐ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق و اعتماد کے ساتھ، ببانگِ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا۔ کل شیئٍ من امرِ جاھلیت تحت قدمی موضوع

ہاں! زمانہ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز

قرآنی مملکت میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت

کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا، بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (۳/۱۱۰) تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے تشکیل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے، تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین، یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا۔ وَ الْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ۔ (۸۲/۱۹)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ۔ (۳/۷۹) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں، این است و بس

جب عہد فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے، تو صحابہ رضؓ کیطرف سے اسکا جواب ملا تھا کہ مالنا ملک۔ بل لنا امیر۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں۔ ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت، جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

> یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

> یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کریگا تو میں اس وقت تک اسے نہ چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے، بادشاہت کیطرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو کچھ لوں اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔ لہٰذا مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں

اہل و عیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸/۴۶) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّةَ اَعْيُنٍ۔ ۲۵/۷۴) کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن۔ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ۔ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (۶۴/۱۴) یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔ تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقامِ بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ۔ ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اسے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دیدی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرانا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دیدی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے۔ اور یہیں سے فساد کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔ قرآنی

مملکت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا — اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ اُن کے حصہ میں ہو۔ یہ اسلئے کہ حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں — قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا — ؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔ ان کا دستور تھا کہ

> جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرکے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔ اگر تم محتاط رہوگے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں اُن سے دگنی سزا دونگا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔ (تاریخ عمر۔ ابن جوزی)

———(۰)———

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت، جس میں ہر صاحب اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ - فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ - وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى - (۲۶/۳۸)۔ تمہیں مملکت میں صاحب اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہوگیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہوگا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہوسکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہوسکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین اصولی طور پر خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں۔ اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو

اپنے زمانے کے حالات کیمطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف سب سے پہلی آیت میں 'الکتاب' کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطہ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات' (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہیگا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کریگی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیل کار۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۴۸)

اُس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی۔ نہ ہی اس سے کچھ لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکیگا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱) اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائینگے۔ اس میں انتظام ایسا ہوگا کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۴) اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۵۳/۳۸)۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتمآبؐ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے ساختہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر میری سگی بیٹی ۔۔۔ فاطمہؓ ۔۔۔ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہیئے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر اسے از سر نو پبلک میں سزا دی۔ جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو

کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو تو آپ نے گورنر، اس کے بیٹے اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد، آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ - (۴۰/۱۹)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گذرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ حسبِ دستور، افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سُنا کہ ایک خیمے کے اندر ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولھے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی کیونکہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اُس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آجائے گی وہ گھر نور سے بھر جائیگا۔

پہل کہاں سے ہو؟

لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے اربابِ حل و عقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے۔ اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔ ـــ كَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ - (۲۷/۴۸)۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائیگی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۱۸/۲۸) اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

اگر ایک ناک کٹا، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمر رضؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعیٔ اوّل حضور نبی اکرم نے خود فرمایا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا کہ جس کی رُو سے خود امیرِ مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے، آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا۔ اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

(۰)

سوشل جسٹس

یہ تھا عدل — یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے

آجکل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (JUST) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کس چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب — DUE) کا تعین، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں؟ یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گزرا ہے اس میں (EMIL BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائیگا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق

قرآن کی رُو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ ازروئے قوانینِ خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے سوشل جسٹس کے معنی ہونگے ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

سطحِ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اسلئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ - (۶/۱۵۲)

(تم مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی
ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے — یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری — اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشو و نما فراہم کرنا۔ اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ، زمین ہے۔ اور قرآن کی رو سے، زمین پر — جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوتی ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ،

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے
رہنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں آپؐ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ — لَنَا رَقَابُ الْاَرْضِ — زمین مملکت کی رہے گی۔

ربٰو کا مفہوم

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد سب سے اہم سوال حصولِ دولت کا ہے۔ عصرِ حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہونا چاہیئے، یا سرمایہ (CAPITAL) کا۔ اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ اربابِ فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے۔ اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COMMERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے، ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی

خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا - ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ - (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا و رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظامِ حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربوٰ کے معنی ہیں "سرمایہ پر بڑھوتی" (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ربوٰ کا مرتکب اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى - (۵۳/۳۹) یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکیگا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ - (۲/۲۱۹) تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

> رسول اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اُسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے۔

FROM EACH ACCORDING TO HIS CAPACITY ;

TO EACH ACCORDING TO HIS NEEDS .

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے، ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں۔ سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ

غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دُوگنا حصہ۔ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق — یعنی سامانِ زیست — مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۔ (۲۲/۲۳) نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات۔ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ ۔ (۱۸/۳۱) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔ سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۔ مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۔ (۷۶/۱۵) چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ۔ (۷۶/۲۰) عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا، بلکہ ہر فردِ معاشرہ کیلئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملیگا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسّر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دناءت کے انسانیت کُش عیوب و ذمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و ذبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔ حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں — اور دوسری طرف بے حمیّتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ۔ یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان وجہ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدنگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ۔ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۔ (۵۶/۲۵-۲۶) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز و آہنگ جاں افروز سنائی دیتی ہے۔ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ۔ (۱۵/۴۷) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبال نے

جاوید نامہ میں ; ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

فکرِ شاں بے درد و سوز اکتساب | راز دانِ کیمیائے آفتاب!
کس ز دینار و درم آگاہ نیست | ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر | کار ہا را کس نمی سنجد بزر
سوت کش دہقاں چراغش روشن است | از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجو | حاصلش بے شرکتِ غیرے از و
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں | نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ | از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش
نے صدا ہائے گدایاں در دِ گوش

آخر میں اقبالؒ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی. یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آنجا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۔ (۲۱/۹۲). اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیبِ گلو اور نیچے ساری اُمت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (۳/۷۸) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطہ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود اربابِ نظم و نسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ ؛

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ

ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے اور حسن و خوبی چل سکتا ہے جب اس کے عمّال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ

> یاد رکھو! جس شخص کے سپرد امت کا کوئی اقتدار ہوا۔ اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولایت کوفہ کے لئے ایک عامل کے کارکن کی ضرورت تھی جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے، آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا — عبداللہ — یہ سنکر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بیشک ان خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمّالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ۔

> سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب چارہ دو۔ ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا ہے۔ یہ عدم تحفظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد زر اندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے

پچھلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اوّل میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ **میں مر جاؤں گا**۔ اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان

موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا) مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد۔ اس کے زور بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبال کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے چکی کے اس پاٹ (MILL- STONE) کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ سے کہا کہ،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (۲۳/۵۱)

اے ہمارے رسولو! خوشگوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا وہاں اُسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ — وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵) وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آگئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ۔ (۲۰/۱۱۷) تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا۔ اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آگیا جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲/۳۶) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آگئی جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

—— (•) ——

بعثتِ نبی اکرمؐ کا مقصد

قرآن کریم نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور

اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل وہ خوف وہراس تھا جو "روحانی قوتوں" کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں۔ ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ تب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اکڑ کر یہ نہیں کہہ سکیگا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اُس نے نفی میں جواب دیا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے۔ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اسکے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

> مجھے یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ "چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔" اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی۔ اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ان اقدار کی رُو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حُزن

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بُری طرح کچل رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے۔ یعنی روٹی کی فکر۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذن بال کشائی دے دیا۔ جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہو گی کہ — لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

---

[1] ختم نبوت کے بعد "آسمانی آواز" قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ جو قیامت تک تمام نوع انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

یحزنون - ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن - یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حُزن سے مامون ہونگے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں - کسی آنے والے خطرے کے احساس سے ہراساں ۔۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔۔ بے خوفی اور امن کے ملنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیر دستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح ہوتا ہے، سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکایک سواری کو روکا، نیچے اترے، اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا، اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار حضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی۔ جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں ۔۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے، جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔ کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے خدا کا وہ نظام جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت، تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۔ (۳۵/۳۴-۳۵) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے، نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی۔ نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے ۔۔ فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی، یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ - سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخورِ حمد و ستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشو و نما کرتا ہے۔ اور قرآن کی آخری سورت میں ربّ النّاس کہا گیا ہے۔

یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد و ستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست و کشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد و ستائش قرار اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے اربابِ اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا۔ (۳/۱۸۸)۔ ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے تو وہ اس سے کہہ دیتے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۔ (۷۶/۹)، ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے "امام مہدی" کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا۔ ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ نہ کہ کسی ماورائی الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپؐ نے اس سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ يَقْسِمُ الْمَالَ صَحِيْحًا۔ وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ بِالسَّوِيَّةِ بَيْنَ النَّاسِ۔ تسویہ کے معنی ہوتے ہیں کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ اَلسَّوِيُّ۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ اِسْتَوَى الرَّجُلُ۔ کے معنی ہیں اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃ کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط۔ بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبۂ عام میں کہا تھا کہ

> لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا

ہوجائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہوچکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامت کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبال) نے یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔

لیکن ـــ

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کردیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سوچکے ہم

اس لئے میں اس خواب (یا قصہ) کی تفصیل میں جانے کے بجائے اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کردوں۔ جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوتی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا .. ..

تم انہیں اس شخص کی عبرت آموز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات راہ عطا کردیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہوگیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا۔ اور یوں راستے سے بے راہ رو ہوگیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ، تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ـ یہ حالت ہوجاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں جھٹلاتی ہے ـــ

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ـ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ انہیں کیا ہوگیا۔ سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا

بِاٰیٰتِنَا۔ اُف! کس قدر بُری حالت ہوجاتی ہے اُس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ — وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ — وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں، خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں — بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۷/۱۷۹)۔ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

(جنوری ۱۹۶۷ء)

وقت کا اہم تقاضا

اب جبکہ پاکستان کی از سرِ نو تشکیل و تعمیر کا سوال ابھر کر سامنے آگیا ہے، ہر ایک کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس پاکستان کا انداز کیا ہوگا جس کا تصور قائدِ اعظمؒ نے دیا تھا۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا صحیح اور نہایت اطمینان بخش جواب پرویز صاحب ہی دے سکتے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر اس دشت کی سیاحی میں گزار دی ہے اور جنہیں دس سال تک خود قائدِ اعظمؒ کی رفاقت میں تحریکِ پاکستان کے فروغ کے لئے مصروفِ کار رہنے کی سعادت میسر رہی۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم، نظریۂ پاکستان اور تصورِ پاکستان سے متعلق پرویز صاحب کے خطبات و مقالات کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں جو اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھیگا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہمارے نوجوان طبقہ کے دل میں اس ضمن میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں رہیگا کہ ہماری زندگی کے لئے پاکستان کا وجود ناگزیر تھا اور اب بھی ناگزیر ہے۔ کتاب پریس میں جا چکی ہے۔ اور عنقریب شائع ہوجائے گی۔

(ناظم)

قوموں کی تباہی کا موجب

منافقین

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴/۱۴۵)

——— منافقین کا مقام، جہنم کا سب سے نچلا درجہ ہے ———

قرآن کریم نے (سورۂ فاتحہ کے بعد) اپنے پہلے صفحہ پر نوعِ انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ گروہ اوّل ان افراد پر مشتمل ہے جو ابدی صداقتوں پر دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتے ہیں، انہیں جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ان صداقتوں سے انکار کرتے اور ان سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ وہ یہ کچھ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کھلم کھلا کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جماعتِ اوّل کا دل اور زبان صداقتوں کے اعتراف و اقرار میں ہم آہنگ ہوتے ہیں، اور اس (دوسری) جماعت کے افراد کا دل اور زبان ان (صداقتوں) کے انکار میں ہم آہنگ۔ انہیں کفار کی جماعت کہا جاتا ہے۔

اور تیسرا گروہ ان افراد کا ہے مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ۔ (۲/۸) جو زبان سے تو ان صداقتوں کا اقرار کرتے ہیں لیکن دل سے انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے دل اور زبان میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ انہیں قرآن کریم کی اصطلاح میں منافقین کہا جاتا ہے۔ سورۃ المنٰفقون میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جب کہا کہ

> اے رسول! یہ منافقین تیرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔

اس کے بعد ہے:۔

> خدا کو اس بات کا علم ہے کہ تو اس کا رسول ہے (یعنی جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں وہ صداقت اور حقیقت ہے) لیکن (اس کے باوجود) خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق اوّل درجے کے جھوٹے ہیں۔

اور اس کے بعد اس کی وجہ بیان کی کہ :

یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان کو اپنے لئے سپر بناتے ہیں ۔ (۶۳/۲)

دوسری جگہ ان کے متعلق کہا کہ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۔ (۳/۱۶۷) یہ لوگ اپنی زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے۔ یعنی ان کے دل اور زبان میں ہم آہنگی نہیں۔

اس سے ہمارے سامنے "منافق" کی تعریف (DEFINITION) آگئی۔ یعنی وہ کہ جس کے دل میں کچھ اور ہو اور زبان سے کچھ اور کہے اور ایسا کچھ دیدہ دانستہ دھوکا دینے کی خاطر کرے۔ اسی لئے سورۃ بقرہ میں منافقین کے متعلق کہا کہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ (۲/۹)۔ یہ لوگ اللہ کو اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ (نیز ۴/۱۴۲)۔ منافق خدا کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے کہ اپنے دعوائے ایمان میں سچا ہے۔ حالانکہ وہ جماعتِ مومنین کا بدترین دشمن ہوتا ہے۔ (۶۳/۲) (۵۸/۱۴)۔ وہ چاہتا ہے کہ دلفریب چکنی چپڑی باتوں سے تمہیں یقین دلا دے کہ وہ تم میں سے ہی ہے۔ حالانکہ وہ درحقیقت تم میں سے نہیں ہوتا (۹/۵۶) وہ تمہیں اپنی باتوں سے راضی رکھنا چاہتا ہے حالانکہ جس وقت وہ تمہیں اپنی صداقت کیشی اور وفاشعاری کا یقین دلا رہا ہوتا ہے، اس کا دل اس سے بغاوت کر رہا ہوتا ہے (۴۸/۱۱)

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ جب ابدی صداقتوں (قرآن کریم) کو دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ تسلیم کر لیا جائے تو اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ایک اور گروہ کا بھی ذکر کیا ہے جس نے ان صداقتوں کو اس طرح تسلیم تو نہیں کیا ہوتا ۔ یعنی ان کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت تو نہیں ہوتا ۔ لیکن ان کا شمار منافقین میں نہیں ہوتا۔ جب مدینہ میں اسلامی مملکت، بایں شوکت و سطوت قائم ہو گئی تو بہت سے بدوی قبائل حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور انہوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ ہم ایمان لا کر جماعتِ مومنین میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے متعلق ارشادِ خداوندی ہوا کہ (اے رسول!)

ان سے کہو کہ تم ابھی یہ نہ کہو کہ "ہم ایمان لے آئے ہیں" تم سردست اتنا ہی کہو کہ ہم نے اس نظامِ خداوندی کو تسلیم کر لیا ہے۔ ایمان کا دعویٰ ابھی اس لئے نہ کرو کہ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا جب رفتہ رفتہ تم اپنی سیرت و کردار سے اپنے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا دو گے تو اس وقت تم اپنے آپ کو مومن کہنا۔ لیکن مطمئن رہو کہ اس دوران میں بھی تم جو کام اس جماعت کے ساتھ مل کر کرو گے، اس کا تمہیں پورا پورا اجر ملیگا ۔ (۴۹/۱۴)

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں گروہوں میں بھی کتنا فرق ہے۔ منافقین کا گروہ، ایمان نہیں لاتا لیکن زبان سے اس کا اقرار کر کے، جماعتِ مومنین کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ یہ اپنے ایمان کو اپنے لئے سپر بناتا ہے۔ لیکن یہ دوسرا گروہ دھوکا نہیں دیتا۔ یہی وہ باریک سا فرق ہے جسے نمایاں کرنے کے لئے قرآن کریم نے منافقین کے متعلق تو کہا کہ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (۵/۴۱) ان کے دل ایمان لائے ہی نہیں۔ اور ان اعراب کے متعلق کہا کہ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا" موجودہ مسلمانوں کو بھی ان دو شقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک تو ہمارا وہ ہم غیر جو پیدائشی مسلمان ہے۔ اس نے دل اور دماغ کے اطمینان کے ساتھ، علیٰ وجہ البصیرت ایمان اختیار نہیں کیا۔ وہ تقلیداً اس راستے پر چل رہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ کسی کو دھوکا دینے کی خاطر اپنے آپ کو مسلمان نہیں ظاہر کرتا۔ انہیں اسلام

سے ناواقف، جاہل کہا جائے گا، منافق نہیں۔ لیکن دوسرا گروہ ان "مسلمانوں" کا ہے جو دل سے ان ابدی صداقتوں سے انکار ہی نہیں، (بلکہ بغاوت) کرتا ہے۔ لیکن ان کی بعض مصلحت کوشیاں اور مفاد پرستیاں انہیں اس انکار کا اعلان کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس لئے وہ دوسروں کو دھوکا دینے کی خاطر، اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کا شمار (قرآنی اصطلاح کے مطابق) منافقین میں ہوتا ہے۔ اور یہی ہیں وہ جو ہماری اس بحث کا موضوع ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ منافقت کے سلسلہ میں سوال صرف کفر اور ایمان کا نہیں۔ زندگی کے کسی معاملہ میں بھی جب صورت یہ ہو کہ آپ کے دل میں کچھ اور ہے اور زبان سے کچھ اور کہہ رہے ہیں، تو یہ بھی منافقت ہے۔ اگر ہم اس مادہ (ن۔ف۔ق) پر غور کریں جس سے یہ لفظ (منافق) بنا ہے، تو منافقت کا صحیح مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ بہت سے جانور بلوں میں رہتے ہیں اور وہاں سے وہ آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن جنگل کا چوہا ایسا بل بناتا ہے جس میں وہ بہت سے سوراخ رکھ لیتا ہے اور ان سوراخوں کو باریک سی مٹی سے ڈھانپ دیتا ہے اور انہیں اس وقت سر مار کر کھول لیتا ہے جب کوئی دشمن اسے بل کے اندر سے پکڑنے کی کوشش کرے۔ اس اعتبار سے اس سرنگ کو جس میں داخل ہونے والے راستے کے ساتھ ہی باہر نکلنے کا راستہ بھی بنا لیا جائے نفق کہتے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے، منافق وہ ہے جو کسی جماعت یا پروگرام میں شریک ہونے کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھ لے کہ اگر مجھے اس سے نکلنا پڑے تو اس کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دورِ حاضرہ کی ساری سیاست کا مدار منافقت پر ہے۔ جب کسی سے کوئی وعدہ کیا جائے تو پہلے سوچ لیا جائے کہ اس سے مکرنے کی شکل کیا ہوگی۔ جب کسی قوم سے کوئی معاہدہ کیا جائے تو اس میں نہایت فریب کارانہ انداز سے ایسی شقیں رکھ لی جائیں جن کی رُو سے اسے بآسانی توڑا جا سکے۔ جب کوئی بیان دیا جائے تو ایسی زبان میں (جسے ڈپلومیٹک لینگویج کہا جاتا ہے) کہ جب جی چاہے ان الفاظ کو دوسرے معانی پہنا دیئے جائیں۔ یعنی اس ابلیسی سیاست میں، بات کرنے والا پہلے سے سوچ لیتا ہے کہ اس سے مکر جانے کا راستہ کونسا ہے۔ یہ ایسی سرنگ ہے جس میں داخل ہونے والا اس سے نکلنے کے دو چار مختلف راستے پہلے سے تیار کر چھوڑتا ہے۔ لیکن انہیں شاعرانہ فریب کاریوں کی خاکستر سے، بڑی صفائی سے ڈھانپے رکھتا ہے۔ آج قومیں، ایک دوسرے کے ساتھ یہی کچھ کر رہی ہیں۔ لیکن جب کسی ایک قوم کے اربابِ حل و عقد خود اپنی قوم کے ساتھ ہی کچھ کرنے لگ جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کی روش کو اس شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کسی دوسری غلط روش کے حصے اتنی وضاحت و صراحت نہیں آئی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس باب میں کیا کہا ہے۔ اور پھر اس آئینے میں (ساتھ کے ساتھ) اپنی صورت کو بھی دیکھتے جائیں۔

(۰)

پہلی چیز یہ کہ یہ لوگ جماعتِ مومنین کے اندر گھل مل کر رہتے ہیں — اور یہی وہ دامِ ہمرنگ زمین ہے جس سے یہ ان لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ اس اختلاط و ارتباط کے لئے یہ جماعتِ مومنین کے ہر پروگرام میں شریک ہوتے ہیں۔ خود موجودہ دور میں دیکھئے۔ کیفیت یہ ہے کہ نہ خدا پر ایمان ہے، نہ اس کے رسول پر۔ نہ قرآن کو صداقت اور حقیقت مانتے ہیں، نہ قانونِ مکافاتِ عمل پر۔ لیکن اس کے باوجود نمازوں میں (اور نہ ہی تو عیدین میں) انکے

ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ میلاد کی مجلسوں میں (بظاہر) نہایت عقیدتمندی سے شرکت کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پہ جاتے ہیں، اُن کے عرسوں کی تقاریب میں شریک ہوتے ہیں۔ مزاروں کو غسل دیتے ہیں۔ ان پر چادریں چڑھاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ دکھاوے کی خاطر کرتے ہیں ـــ يُرَاءُونَ النَّاسَ - (۴/۱۴۲)۔ حتّٰے کہ وہ ان کاموں کے لئے چندے اور عطیے بھی دیتے ہیں ـــ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲/۲۶۴) وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ بس لوگوں کو دکھانے کی خاطر روپے دیتے ہیں۔ ہاتھوں سے روپیہ دیتے ہیں، چہرے پر (جھوٹی) مسکراہٹ ہے لیکن دل میں کڑھ رہے ہیں کہ یہ کیا مصیبت گلے آپڑی ہے - (۹/۹۸)

بعض اوقات ان کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ جماعتِ مومنین کے ساتھ اس قدر خلط ملط سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم سچ مچ ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس لئے جب وہ اپنے سرغنوں کے پاس جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ آپ کہیں یہ نہ خیال کرلیں کہ ہم آپ سے غداری کرکے' ان لوگوں کے ساتھ مل جائینگے۔ قطعاً نہیں۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہم ان کی مجالس و محافل میں شریک ہوتے ہیں، ان کی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ انہیں چندہ بھی دے دیتے ہیں' تو (إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ - ۲/۱۴) اس سے ہم ان لوگوں کو اُلّو بناتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں)۔ ورنہ (إِنَّا مَعَكُمْ - ۲/۱۴) ہم تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ سرغنے ان سے کہتے ہیں کہ دیکھنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مذاق مذاق ہی میں ان سے ہمارے راز کی باتیں کہہ دو اور اس طرح وہ ہم پر چڑھ دوڑیں۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ لاحول ولا ..... ہم ایسے ہی احمق ہیں جو اس قسم کی باتیں ان سے کرینگے (۲/۷۶) ہم پر ان لوگوں کی صحبت کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ ہم جس طرح کافر' رہے کر ان کی مجلسوں میں جاتے ہیں' اسی طرح کا کفر لے کر واپس آجاتے ہیں (۵/۶۱)۔ ہمارا ان کے ساتھ مل جانا تو ایک طرف' ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملالیں، (۴/۸۹) یوں سمجھو کہ ہم نہایت مومن اور متقی بنکر' صبح ان کی مجلس میں جاتے ہیں۔ دن بھر یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان میں سے کمزور ایمان کے لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ہم آہنگ کرلیں اور اس کے بعد شام کو اپنوں میں آملتے ہیں۔ (۳/۷۲)

(قرآن کریم کہتا ہے کہ) جب یہ لوگ جماعتِ مومنین کی مجلس میں آتے ہیں اور وہاں ان کے دین کے فروغ اور کامرانیوں کی باتیں سنتے ہیں تو جل بھن کر کباب ہوجاتے ہیں۔ اس وقت تو منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن جب واپس آتے ہیں تو غصے سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی کامیابی نصیب ہوتی ہے تو اس سے ان پر قیامت گزر جاتی ہے' اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یہ خوشیاں مناتے ہیں - (۳/۱۱۹-۱۲۰) ؛ (۹/۵۰)

ــــــــ (۲) ــــــــ

یہ ظاہر ہے کہ حق و باطل کی کشمکش ہر آن جاری ہے' اور جماعتِ مومنین کی زندگی' حق کی مدافعت اور تحفظ کے لئے ایک جہدِ مسلسل ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے اور ہر نوع کی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ اس یقینِ محکم کی بنا پر کرتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور حق ہمیشہ باطل پر غالب آتا ہے۔ حق کی مدافعت ان کا نصب العین حیات اور مقصودِ زندگی ہوتا ہے۔ اسی سے انہیں وہ یکسوئی حاصل ہوتی ہے جس سے ان میں بے پناہ جرأتیں اور بے انتہا قوتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ (اسی یکسوئی کو توحید کہتے ہیں)۔ اسی جماعت میں منافقین بھی شامل ہوتے ہیں' جن کا نہ ایمان ہوتا ہے۔ نہ ہی وہ نصب العین۔ وہ محض اپنی مصلحتوں اور مفاد پرستیوں کے لئے ان کے ہمراہ چلتے ہیں۔ اس راستے میں انکی

کیفیت کیا ہوتی ہے قرآن کریم نے اسے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ سب سے زیادہ خطرناک گھاٹی ہوتی ہے جہاں ان کی فریب دہی جماعتِ مومنین کے لئے سخت نقصان کا موجب ہو سکتی ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جس طرح جماعتِ مومنین کے افراد، مقصد کی ہم آہنگی کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ (منافقین) بھی، اپنے مقصد (یعنی جماعتِ مومنین کی تخریب) کی ہم آہنگی سے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ (۹/۶۷)۔ یعنی یہ لوگ انفرادی طور پر ہی قوم کے درپئے تخریب نہیں ہوتے بلکہ ان کی ایک پارٹی ہوتی ہے جس کے اراکین اس سازش میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ تم سے بھی بنائے رکھیں اور تمہارے فریقِ مخالف سے بھی۔ (۴/۱۴۱)۔ تمہیں کامیابی حاصل ہو تو اسکے ماحصل میں بڑھ چڑھ کر حصہ دار بن جائیں۔ اور اگر فریقِ مقابل کامیاب ہو جائے تو اس سے جا کر کہیں کہ دیکھا! ہم نے ان لوگوں کو دھوکے میں رکھ کر کس طرح تمہارے لئے کامیابی کی راہیں کشادہ کر دیں؟ (۴/۱۴۱)

اس مقام پر قرآن کریم ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اگر تم سے فریب کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ تمہارے مخالفین کے ساتھ خلوص اور صداقت کے تعلقات رکھتے ہیں۔ منافق، کسی کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر صرف اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے وہ ہر ایک کو دھوکا دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ سورۂ حشر میں ہے کہ یہ منافقین تمہارے مخالفین سے بڑے بڑے وعدے کر رہے ہیں کہ تم مسلمانوں پر حملہ کرو۔ ہم اس طرح تمہاری مدد کریں گے اور اس طرح موجبِ تقویت بنیں گے۔ لیکن وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔ (۵۹/۱۱)۔ خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ یہ نہ ان کا ساتھ دیں گے نہ ان کی مدد کریں گے۔ (۵۹/۱۲)۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ کارزارِ حیات میں، یہ کنارے پر بیٹھے (علیٰ حرف) دیکھتے رہتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ۔ نہ یہ ان کی طرف ہوتے ہیں، نہ اُن کی طرف۔ مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ۔ (۴/۱۴۳)۔ دونوں کے بین بین، ادھر لٹکے ہوئے کہ جس کا پلڑا جھک جائے، جھٹ سے اس کی طرف ہو جائیں۔

ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ۔ وہ معاشرہ میں (WHISPERING CAMPAIGN -) جاری رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے لئے ایک لفظ (اَلْخَنَّاس) سے ان کی اس ٹیکنیک کی پردہ دری کر دی ہے۔ خناس کے معنی ہوتے ہیں وہ جو دبے پاؤں، چپکے سے، آئے اور کسی کے کان میں کچھ پھونک کر، اسی طرح دبے پاؤں پیچھے سے پیچھے لوٹ جائے۔ وہ نہایت ہمدرد بن کر آتے ہیں اور نہایت معصوم انداز میں ایسی چنگاری ڈال کر الگ ہو جاتے ہیں، مقصد اس سے ملت میں انتشار پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جماعت کی طرف سے عطیات کی اپیل ہوئی۔ صاحبِ ثروت افراد نے دل کھول کر چندہ دیا۔ لیکن جو لوگ ذی استطاعت نہیں تھے، انہوں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب یہ منافقین اٹھے۔ ایک کے پاس آئے اور نہایت مشفقانہ انداز سے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ فلاں صاحب نے کس طرح بڑھ چڑھ کر چندہ دیا ہے۔ اب دیکھئے وہ اس کے بدلے میں کیا کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے کاروباری ہیں۔ یہ کبھی ایک پیسہ نہیں دیں گے جب تک اس کے بدلے میں دس وصول کرنے کا یقین نہ ہو۔ اور جو غریب کچھ نہیں دے سکے، ان کے متعلق کہیں گے کہ ان کی ظاہرا حالت پر نہ جائیے۔ ان کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے لیکن جان بوجھ کر ایسی حیثیت بنا رکھتے ہیں کہ کچھ دینا نہ پڑے۔ (۹/۷۹)

یہاں تک ہی نہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ان کی دنائت اور ناوک افگنی سے بڑی سے بڑی شخصیت بھی

محفوظ نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ بھی۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا - وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۔ (۹/۵۸)۔ نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ ان (منافقین) کی کیفیت یہ ہے کہ صدقات کی تقسیم میں جتنا کچھ یہ مانگتے ہیں، اگر انہیں اتنا دے دیا جائے تو یہ مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے حصے میں اتنا نہ آئے تو ان کی دنایت کا یہ عالم ہے کہ یہ تمہارے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلانا شروع کر دیتے ہیں اور الزام تراشی تک سے گریز نہیں کرتے۔ مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ جماعت میں بدظنی پھیلائی جائے اور انتشار پیدا کیا جائے۔

———(۰)———

نبی اکرمؐ کی قریب قریب ساری مدنی زندگی جنگوں میں گزری۔ اس زمانے میں فوج، عام جماعت سے الگ نہیں ہوتی تھی۔ (STANDING ARMY) کا اس وقت تصور ہی نہیں تھا۔ اس لئے ہر مومن مجاہد (سپاہی) ہوتا تھا اور پوری کی پوری جماعت، فوج۔ اب ظاہر ہے کہ جب یہ فوج، میدانِ جنگ میں جاتی تھی تو اس میں یہ منافق بھی شامل ہوتے تھے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ان میں سے اکثر خصوصیت کے ساتھ، فوج میں شامل ہو جاتے تھے کیونکہ یہ مواقع ان کی تخریب کاری کے لئے بڑے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ غداری اور سازش، جنگ کے زمانے میں بڑے تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس لئے منافقین ایسے مواقع کو کب ہاتھ سے جانے دیتے ہیں! ایک ایک منافق نے جس طرح سلطنتوں کی سلطنتیں تباہ کرا دیں، تاریخ کے خونی اوراق اس کی زندہ شہادات ہیں۔ چونکہ یہ گھاٹیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں اس لئے قرآن کریم نے (بالخصوص) سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں، بڑی تفصیل سے ان مذموم اور ملعون تخریبی مساعی کا ذکر کیا ہے۔ جو منافقین کی طرف سے جنگ کی حالت میں بروئے کار آئیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اس وقت ممکن نہیں، اس لئے ان کے اہم مقامات کو اجمالاً پیش کیا جاتا ہے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں، اسلام میں، ہر مومن سپاہی ہوتا ہے اور سپاہی بھی ایسا جو جہاد (قتال فی سبیل اللہ) کا دل سے متمنی ہو اور شہادت کا آرزو مند۔ اسی لئے اگر اس کی زندگی میں کبھی قتال کا موقعہ آ جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا — وہ رقصاں و فرحاں، کفن بدوش، میدانِ جنگ کی طرف رواں دواں چلا جاتا ہے۔ لیکن منافق کو اس میں موت نظر آتی ہے۔ وہ اس سے جی چراتا ہے اور ہزار بہانے بناتا ہے کہ اس سے کسی طرح جان بچ جائے۔ اس کی معذرتیں ساری خود ساختہ، اور اس کی پیش کردہ وجوہات بہانہ سازی کے سوا کچھ نہیں ہوتیں۔ قرآن کے الفاظ میں۔ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ (۴۸/۱۱)۔ وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا — اگر وہ اپنی بہانہ سازیوں میں کامیاب ہو کر پیچھے رہ جائیں اور اتفاق ایسا ہو کہ جماعتِ مجاہدین کو کچھ نقصان اٹھانا پڑے تو ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ دیکھا! ہم انہیں سمجھاتے رہے کہ جنگ کے لئے نہ نکلو، نقصان اٹھاؤ گے، لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اب وہی ہوا جو ہم کہتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ساتھ نہیں گئے، ورنہ ہم بھی انہی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتے۔ (۳/۱۶۸) اور اس کے بعد ذرا اور کھل کر بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غور کیجئے! ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ خدا کی نصرت ہمارے ساتھ ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ ہم کفار سے مغلوب ہو جائیں۔ اب ان کے تمام دعاوی کی قلعی کھل گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ

دِیۡنُهُمۡ - (۸/۴۹)۔ ان کے دین نے، ان سے اس قسم کے خوشنما وعدے کر کے، انہیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے جس کی وجہ سے یہ بلا سوچے سمجھے اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ یَقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ۔ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم نے اسی بنا پر پہلے ہی سے احتیاط برت لی تھی اور ان کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ وَ یَتَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ فَرِحُوۡنَ - (۹/۵۰) اور اس طرح بغلیں بجاتے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ (۹/۵۰)۔ اگر جماعتِ مجاہدین کو کامیابی نصیب ہوتی ہے تو یہ اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

اور جو ان میں سے ساتھ چلے جاتے ہیں، تو میدانِ جنگ میں جا کر اس قسم کی وسوسہ اندازیاں اور سرگوشیاں کرتے ہیں جن سے بددلی اور بددلی پھیل جائے۔ کبھی کہیں گے کہ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا۔ (۳۳/۱۲) یہ جو ہم سے فتوحات کے وعدے کئے گئے ہیں اور عالمگیر حکمرانی کا حسین خواب دکھایا گیا ہے، ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس طرح مفت کی موت مرنے سے حاصل کیا ہوگا؟ کبھی کسی ایک پارٹی سے کہیں گے کہ بابا! لَا مُقَامَ لَكُمۡ فَارۡجِعُوۡا۔ (۳۳/۱۳)۔ تمہاری یہاں کیا پوزیشن اور کیا مقام ہے۔ اگر جنگ میں کامیابی بھی ہوئی تو اس کا تمام تر فائدہ یہ دوسرا گروہ سمیٹ لے گا اور تم خواہ مخواہ قربانی کے بکرے بن کر رہ جاؤ گے (۳۳/۱۳) کبھی عین معرکے کے وقت کہہ دیں گے کہ پیچھے ہمارا گھربار غیر محفوظ ہے اس لئے ہمیں تو اجازت دیجئے کہ ہم واپس چلے جائیں۔ (۳۳/۱۳)۔ کبھی یہ سرگوشیاں کریں گے کہ صاحب! یہاں تو خالص ڈکٹیٹرشپ چل رہا ہے۔ جو حکم جی چاہتا ہے دے دیا جاتا ہے۔ ہم سے کوئی پوچھتا تک نہیں۔ (۳/۱۵۴)

آپ سوچئے کہ جنگ کی حالت میں اس قسم کی وساوس انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کا نتیجہ کس قدر خطرناک ہوتا ہے؟

——— (۰) ———

یوں تو منافقت ہر شعبہ میں خطرناک ہوتی ہے لیکن جب یہ مذہب کا نقاب اوڑھ کر آتی ہے تو اس کی تباہ کاریاں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ مذہبی منافقت کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ یَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ۔ (۲/۱۴۶) وہ خدا کی بتائی ہوئی سچی بات کو چھپا کر رکھیں گے کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے ان کی نقاب دری ہو جاتی ہے۔ حقیقت اور صداقت کو چھپا دینے کے بعد، وہ کریں گے یہ کہ یَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ۔ (۲/۷۹) اپنی مصلحتوں کے مطابق فیصلے کریں گے، فتوے لکھیں گے، اور انہیں لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کریں گے، کہ یہ شریعتِ خداوندی کا فیصلہ ہے۔ یہ خدا اور رسول کا حکم ہے۔ یہ دین ہے۔ اسلام ہے۔ اور یہ سب اس لئے — لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا۔ (۲/۷۹) تاکہ اس سے کچھ مفاد حاصل ہو جائے۔ یہ دین فروشی، منافقت کی بدترین شکل ہے، اور مذہبی پیشوائیت کا سارا کاروبار اسی کے سہارے چلتا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَ اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ تُعۡجِبُكَ اَجۡسَامُهُمۡ۔ ان کی ظاہرا شکل و صورت دیکھئے تو نہایت متقی اور پرہیزگار، خشوع و خضوع کے پیکر، ورع و توکل کے مجسمے، پابندیٔ شریعت کے دلکش مظاہر، سراپا روحانیت کے مشردہ مجسمہ — وَ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِهِمۡ۔ ان کی باتیں سنئے تو ایسی دلکش اور جاذب کہ جی چاہے سنتے ہی جائیے۔ نہایت دلفریب۔ بڑی خوش کن ایک ایک لفظ صداقت و دیانت، امانت و شرافت، خلوص و ایثار، اسلام سے شیفتگی و وابستگی، دین کے لئے ہر قسم کی قربانی کی درخشندہ شہادت۔ لیکن كَاَنَّهُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ۔ (۶۳/۴) ذرا نقاب اٹھا دیجئے تو

"قبر چونے گچ اور مردہ بے ایمان" کا آئینہ۔ سر سے پاؤں تک تصنع۔ ایک ایک حرکت میں بناوٹ۔ ایک ایک لفظ میں منافقت۔ ساری زندگی مصنوعی۔ ہر وقت دھڑکا کہ کہیں بھید نہ کھل جائے۔ اس لئے حالت یہ کہ یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَۃٍ عَلَیْھِمْ (۶۳/۴) کہیں پتہ کھلا اور ان کی جان نکل گئی کہ آئی مصیبت۔ نتیجہ یہ کہ کسی نے ان کی کسی بات سے ذرا سا بھی اختلاف کیا اور انہوں نے اس پر کفر و ارتداد کا فتویٰ لگایا۔ اور پھر عوام کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ اس بیچارے کے لئے جینا محال ہو جائے۔

مذہبی منافقت کی یہ عام کارستانیاں بھی کچھ خطرناک نہیں ہوتیں، لیکن اس کی تباہ کاریاں اس وقت انتہا تک پہنچ جاتی ہیں جب وہ اپنی مفاد پرستیوں کے لئے امت میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔ امت کی وحدت، دین کی بنیاد ہے اور عقیدۂ توحید کی محسوس شہادت۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ مسلمانو! دیکھنا تم خدائے واحد پر ایمان لانے کے بعد کہیں پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر خدا کا عطا کردہ دین باقی نہیں رہتا کیونکہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک کو حق و صداقت قرار دیکر مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ (۳۰/۳۲) یہ ہے مذہبی منافقت کی انتہائی تباہ کاری جس سے ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور وہ کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتی۔

مساجد دین کی وحدت کے تنظیمی مراکز بننے کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں، لیکن مذہبی منافقت انہی مساجد کو ملت میں تفرقہ پیدا کرنے کا بنیادی ذریعہ بنا دیتی ہے۔ جب مدینہ کے منافقین نے "امت میں تفرقہ اندازی کے لئے یہ مقدس حربہ" استعمال کیا، تو چونکہ یہ ایک عظیم تباہی کا پیش خیمہ تھا، اس لئے قرآن کریم نے نہایت شدت سے اس کی مخالفت کی اور سخت ترین الفاظ میں اس کا مواخذہ کیا۔ سورۂ توبہ کی آیات (۱۰۷-۱۱۰) کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے۔ ذیل میں ہم ان آیات کا مفہوم درج کرتے ہیں۔ فرمایا۔

وہ یہ منافقین اپنی چالوں میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کروالی ہے۔ اس سے ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم بڑے پکے مومن اور دیندار ہیں، لیکن درحقیقت ان کا مقصد یہ ہے کہ اس سے دین خداوندی کو نقصان پہنچایا جائے۔ اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں۔ یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ لہٰذا جسے تم مسجد سمجھ رہے ہو، یہ مسجد نہیں، یہ ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے جو دین خداوندی کے خلاف مصروف جنگ و پیکار ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے گا تو یہ قسمیں کھا کھا کر کہینگے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی نیک نیتی سے، محض لوجہ اللہ تعمیر کیا ہے۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ سراسر جھوٹ بولتے ہیں۔

اے رسول! تم اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا۔ جو مسجد ملت میں انتشار اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرے، کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ خدا کا رسول اس میں اپنا قدم رکھے؟ تمہارا نہ ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہے نہ ان کی تعمیر کردہ مسجد سے کوئی تعلق (۹/۱۰۸)۔ اس کی مستحق صرف وہ مسجد ہے جس کی بنیاد پہلے دن سے قوانین خداوندی کی نگہداشت پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہی لوگ آتے ہیں جو فرقہ بندی اور گروہ سازی کے شرک سے پاک اور صاف رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی نگاہوں میں محبوب ہیں۔

ان سے پوچھو کہ کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت، اور منشائے خداوندی سے ہم آہنگی پر رکھی ہو، خیر و برکت کا کام کر رہا ہے، یا وہ جس نے یہ بنیاد ریت کے ایسے تودوں کے کنارے پر رکھی ہو جو کٹ کٹ کر دریا میں گرتے چلے جا رہے ہوں، اور اس طرح وہ عمارت، اپنے تعمیر کرنے والے کو ساتھ لے کر جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں ان پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کبھی کشادہ نہیں ہو سکتی۔

یاد رکھو! ان کی یہ عمارت جو انہوں نے اس مقصد کے لئے بنائی ہے، ان کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ اس سے ان کے دل کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جائے گا۔ ان کے غصے اور حسد کی آگ میں کمی نہیں ہو گی تاآنکہ ان کے دل شدتِ اضطراب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ ان سے کہدو کہ خدا کی یہ باتیں یونہی دھمکی نہیں، علم و حکمت پر مبنی ہیں اور جو کچھ ان سے کہا گیا ہے وہ واقع ہو کر رہیگا۔" (مفہوم القرآن - صفحہ ۴۸۰)

یہ تھی مذہب کے نقاب میں منافقت کی تعمیر کردہ سب سے پہلی مسجد۔ اس کے متعلق خدا نے یہ ارشاد فرمایا۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ نے اس مسجد کو جلوا دیا۔ حضورؐ نے اس پہلی مسجد کے ساتھ تو یہ کیا، لیکن آپ سوچئے کہ کیا اب ہماری ہر مسجد، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب نہیں؟ اس تفرقہ کا عملی مشاہدہ کرنا ہو، دیکھنا ہو تو آپ کسی شہر کے کسی بھرے بازار میں کھڑے ہو جائیے۔ مسلمان (وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں)، یہاں سے وہاں تک اکٹھے چلتے پھرتے، باتیں اور کاروبار کرتے، آپس میں ملتے ملاتے دکھائی دیں گے۔ ان میں کسی قسم کا کوئی تفریقی نشان نظر نہیں آئے گا۔ لیکن عین اس وقت جب مساجد سے اذان کی آواز بلند ہو گی تو آپ دیکھیں گے کہ یہی مسلمان، گروہوں اور ٹولیوں میں بٹ جائیں گے۔ کوئی ایک مسجد کی طرف جاتا دکھائی دے گا کوئی دوسری کی طرف۔ اور اس تفرق کی شدت کا یہ عالم ہو گا کہ اگر ایک مسلمان بھولے سے کسی دوسرے فرقہ والوں کی مسجد میں چلا جائے گا تو وہاں سر پھٹول ہو جائے گی اور اسے دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ سوچیئے، کہ کیا ہماری ساجد کی وہی کیفیت نہیں جسے قرآن کریم نے منافقین کی سب سے پہلی مسجد کی خصوصیات بتایا تھا کہ وہ مسجد نہیں بلکہ كُفْرًا وَ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَ إِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ - (۹/۱۰۷) کی عملی تفسیر ہے۔

لیکن یہ تفرقہ انگیزی صرف مساجد تک محدود نہیں۔ پاکستان میں اس کی جڑیں بہت دور تک پھیلا دی گئی ہیں۔ ذرا اس ایک نکتہ پر غور کیجئے۔ اعتراف کیا جاتا ہے کہ

> کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے اور ان کے لئے قابلِ قبول ہو۔

(ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

اور اس کے ساتھ ہی، حکومت پر بار بار زور دیا جا رہا ہے کہ دستورِ پاکستان میں یہ شق رکھی جائے کہ

> مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

آپ سوچئے کہ ان دو باہمد گر متضاد حقیقتوں کا عملی نتیجہ کیا ہو گا؟ حکومت "کتاب و سنت کے مطابق" جو قانون بھی بنائیگی، ظاہر ہے کہ وہ کسی نہ کسی فرقے کے نزدیک غیر اسلامی، فلہذا ناقابلِ تسلیم ہو گا۔ وہ فرقہ، اپنے دینی تقاضے کی رُو سے،

اس کی مخالفت کرے گا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ مخالفت بغاوت تک پہنچ جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مذہب کے نقاب میں کس قدر ہلاکت آفریں اور تباہ کن فتنے کے بیج بکھیرے جا رہے ہیں! مساجد کا تفرقہ تو پھر بھی نمازوں تک محدود رہتا ہے۔ یہ تفرقہ، زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوگا اور ملک میں خانہ جنگی پیدا کر دیگا۔

اللہ تعالیٰ نے تفرقہ مٹانے کا طریقہ، اعتصام بحبل اللہ یا تمسک بکتاب اللہ بتایا تھا۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

اے جماعت مومنین! تم سب کے سب مل کر "خدا کی رسی" کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور اپنے انعام خصوصی سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ تم اس وقت تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ دیکھو! اس طرح اللہ اپنے قوانین کو وضاحت سے بیان کر دیتا ہے تاکہ تم فلاح اور کامیابی کے راستے پر چلتے رہو۔ (۳/۱۰۳)

"اعتصام بحبل اللہ" کے معنی یہ ہیں کہ تم زندگی کے ہر گوشے میں یہ دیکھو کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ یہی کتاب تمہارے آئین کا ماخذ اور قوانین کا سرچشمہ قرار پائے۔ اسی سے تم ہر اختلافی معاملہ کا حل تلاش کرو۔ اور یہ سب کچھ اپنے نظام مملکت کی دسترس سے کرو۔ یہ قرآن کریم کی تعلیم ہے لیکن منافق کبھی قرآن کی طرف آنا نہیں چاہتے، اس لئے کہ اس سے ان کی منافقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ — يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۔ (۹/۶۴)۔ منافق اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی سورۃ نازل نہ ہو جائے جس سے ان کے راز فاش ہو جائیں۔ زمانہ نزول قرآن میں تو منافقین کو ڈر تھا کہ کہیں کوئی ایسی سورۃ نازل نہ ہو جائے جس سے انکا بھید کھل جائے۔ اب منافقین، قرآن کی طرف آنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اگر اس کی روشنی میں ان کے اعمال و کردار اور گفتار و رفتار کو پرکھا گیا تو ان کی اصلیت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی اور لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز کو وہ خدا کی شریعت کہہ کر پیش کرتے تھے، وہ ان کا خود ساختہ مذہب تھا۔ خدا کے دین سے اسے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قسم کے غیر اسلامی معتقدات، تصورات، مسالک و مشارب، رسوم و شعائر، جو مسلمانوں میں رائج ہیں، برداشت کر لینگے لیکن دعوت الی القرآن کی اس شدت سے مخالفت کرینگے گویا قیامت برپا ہو گئی ہے۔ قرآن کریم نے، ہر غیر قرآنی سند اور اتھارٹی کو طاغوت کہہ کر پکارا ہے اور منافقین کے متعلق کہا ہے کہ :

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعم خویش سمجھتے اور اس کا دعوے کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم اور انبیائے سابقہ کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن عمل ان کا یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے سرکشی برتیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کے جذبات مفاد پرستی انہیں راہ راست سے بہت دور لے جا رہے ہیں۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم قرآن کی طرف آؤ جس کے احکام، حکومت خداوندی کے سربراہ رسول اللہ،

کیطرف سے نافذ ہوتے ہیں تو یہ منافق اس دعوت سے اعراض برتتے ہوئے دور بھاگ جاتے ہیں (۴/۶۱)۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے دوسری جگہ کہا ہے کہ ان کی منافقت کا عالم یہ ہے کہ جب یہ دیکھیں کہ کسی معاملہ میں قرآن کا فیصلہ ان کے حق میں جاتا ہے گا تو یہ اسے سر آنکھوں پر اٹھائیں گے اور کہیں گے کہ کتاب اللہ سے بہتر فیصلہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب انہیں نظر آئے کہ قرآن کا فیصلہ ان کے خلاف جائے گا تو وہ کہیں گے کہ دین صرف قرآن کے اندر ہی تو نہیں، "دین کا ۹/۱۰ حصہ قرآن سے باہر ہے" اس لئے ہم اسی کی پیروی کریں گے (۲۴/۴۸-۴۹)۔ یہی خارج از قرآن "۹/۱۰ حصہ" امت میں تفرقہ کا موجب ہے اور اسی کے سر پر مذہبی پیشوائیت کا سارا کاروبار چلتا ہے۔ الگ الگ مسجدیں ہیں تو اسی کی بنیاد پر، اور ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہے تو اسی پر متفرع۔ اور یہ نہیں کہ وہ ایسا کچھ جہالت کی بنا پر کرتے ہیں۔ نہیں۔ وہ دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے، منافقت برتتے ہیں۔ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۷۵)

یہ تو تھا مذہب کا گوشہ۔ اور جب زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو منافقت سے کام لیں، تو پھر اس مملکت کا جو حشر ہو سکتا ہے اسے دیکھنے کے لئے ہمیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کا شعار یہ ہوتا ہے کہ زبانی دعووں سے قوم کا دل بہلاتے رہیں، اور جو وعدے کریں، عملاً انہیں کبھی پورا نہ کریں۔ یہ وہ روش ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا تھا کہ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (۶۱/۳)۔ خدا کے نزدیک یہ روش نہایت مذموم ہے کہ تم جو کچھ کہو اسے کر کے نہ دکھاؤ۔ پھر انتہا ہی نہیں کہ یہ لوگ قوم کو زبانی وعدوں سے ٹرخاتے اور غلط بیانیوں سے بہلاتے رہتے ہیں، وہ چاہتے یہ ہیں کہ قوم ان کی مدح و ستائش کے قصیدے بھی پڑھے۔ وَ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا۔ (۳/۱۸۸)۔ "وہ چاہتے یہ ہیں کہ قوم ان کی اُن کاموں کی بنا پر تعریف کرے جنہیں وہ کر کے نہ دکھائیں۔" ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملک میں تباہیاں مچاتے چلے جاتے ہیں، اور اگر کوئی جرأت سے کام لے کر ان سے کہے کہ آپ اس طرح ملک کو کیوں برباد کرتے ہیں، تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ملک کو برباد کر رہے ہیں؟ ہم تو اس کی اصلاح کر رہے ہیں ـــ اور اس پر قرآن کا شاہد عادل، پکار کر کہتا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ـــ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۔ (۲/۱۲)۔ سننے والو! سن لو۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ ہیں جو درحقیقت ملک میں فساد برپا کرتے ہیں۔ اسے تباہیوں کیطرف لئے جا رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس روش سے یہ خود بھی تباہ ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کے کردار و اطوار کا نقشہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ یہ لوگ جب تقریریں کرینگے، بیانات دینگے تو تمہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے۔ تم سمجھو گے کہ یہی لوگ قوم کے نجات دہندگان ہیں۔ بس اب ان کے ہاتھوں بیڑہ پار ہو جائے گا۔ وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۔ اور یہ خدا کی قسمیں کھا کھا کر قوم کو یقین دلائینگے کہ وہ اپنے بیانات میں بالکل مخلص، اور اپنے وعدوں کے بڑے سچے ہیں۔ وہ کلمہ پڑھ پڑھ کر اپنے پکے اور سچے مسلمان ہونے کا یقین دلائیں گے وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲/۲۰۴)، حالانکہ نہ وہ قوم کے بہی خواہ ہوں گے، نہ اس خدا پر ایمان رکھنے والے جس کے کلمہ کو وہ اپنی صداقت کے ثبوت میں بطور شہادت پیش کر رہے ہونگے۔ جب اس طرح یقین دہانیوں کے بعد اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائیگا تو....

اور اس "تو" کو آپ قرآن کے صفحات پر حروف و نقوش کی عبرت سامانیوں میں دیکھئے اور سرزمین پاکستان میں خون اور خاکستر کی جگر پاش کہانیوں میں۔ فرمایا۔ وَ اِذَا تَوَلّٰی۔ جب اقتدار اس کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا۔ وہ انتہائی کوشش کرتا ہے کہ مملکت کی کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہنے۔ ہر طرف ابتری ہی ابتری پھیل جائے، فسادات برپا ہوں۔ نظم و نسق باقی نہ رہے۔ ہر جگہ لاقانونیت پھیل جائے۔ جرائم عام ہو جائیں۔ (CORRUPTION) کا دور دورہ ہو۔ فحاشیاں اور عیاشیاں، وبائی امراض کے جراثیم کی طرح، فضا کو ملوث کر دیں۔ اور جب اس طرح معاملہ حد سے گذر جائے، اور اس کا سنبھالنا اس کے بس میں نہ رہے، تو یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ۔ (۲/۲۰۵) تو وہ ملک کی معیشت کو تباہ و برباد کر دے اور اس قدر خون خرابہ کرے کہ نسلوں کی نسلیں ہلاک ہو جائیں۔ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ بابا! خدا سے ڈرو۔ تم ملک کو کن تباہیوں کے جہنم میں دھکیل رہے ہو تو اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ جھوٹی عزت (FALSE PRESTIGE) کا نشہ اُسے کچھ سننے، سمجھنے نہ دے، اور وہ نہایت متکبرانہ انداز میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اور آگے بڑھتا ہوا، کہاں پہنچ جائے — فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ (۲/۲۰۶) خود بھی جہنم میں جا گرے اور قوم کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے — اُف! کیسا عبرت آموز ہے منافقین کا یہ انجام!

اس میں شبہ نہیں کہ یہ منافق اپنے دورِ اقتدار میں بہت سا مال و دولت جمع کر لیتے ہیں۔ اور وہ بھی گلچھرّے اڑاتے ہیں اور ان کی اولاد بھی۔ لیکن قرآن کا ارشاد ہے کہ

ان کا مال و دولت اور ان کی اولاد کی مرفہ الحالی اور عیش سامانی وجہ تعجب نہیں ہونی چاہیئے۔
خدا کا قانونِ مکافات چاہتا یہ ہے کہ یہی مال و دولت اور ان کی اولاد کی بدعنوانیاں، ان کی
تباہی کا موجب بن جائیں۔ اور یہ تباہی اسی دنیا میں ان کے سامنے آجائے۔ (۹/۵۵)

جب خدا کے قانونِ مہلت کی رو سے، ان کی رسّی دراز ہوتی ہے تو وہ نہایت استہزا آمیز انداز سے کہتے ہیں کہ کہاں ہے خدا کی گرفت۔ لَوْ لَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ۔ (۵۸/۸) اگر خدا کہیں ہے تو وہ ہمیں پکڑتا کیوں نہیں؟ ہماری تدبیریں اتنی محکم اور ہماری قوت ایسی شدید ہے کہ ہم پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن خدا کا قانونِ مکافات ان پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم کس قوت کے زعم میں یہ کچھ کرتے اور کہتے ہو۔ تمہارے کنٹرول میں عسکری قوت ہے۔ فوجوں کا اقتدارِ اعلیٰ تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن تم جانتے نہیں کہ

وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (۴۸/۷)

خدا کے لشکر اس ساری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے تمہارے لشکروں کی حیثیت کیا ہے؟ یہ لشکر تمہیں اس کی گرفت سے نہیں بچا سکتے۔ یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیْمًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ تم دیکھو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات انہیں کس قدر الم انگیز سزا دیتا ہے — انہیں وہ سزا اس دنیا میں بھی ملے گی اور آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں سزا ایسی کہ وَ مَا لَهُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ۔ (۹/۷۴) کہ ان کا نہ کوئی حامی ہو گا نہ ناصر۔ اس دنیا میں ایسی ذلت آمیز اور رسوا کن سزا، اور آخرت میں

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ (۴/۱۴۵)

یہ منافق - جہنم کے سب سے نچلے درجے میں رکھے جائیں گے۔

وہاں انہیں انتہائی ذلت آمیز گداگری کے ٹکڑے کھانے کو ملیں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ

ذُقْ - إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ - (۴۴/۴۹)

اس کا مزہ چکھو! تم بڑے معزز اور ذی اقتدار بنے پھرتے تھے۔

عذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

یہ ہیں وہ منافق جو قسم قسم کے فریب انگیز نقاب اوڑھ کر معاشرہ میں گھسے رہتے ہیں۔ چونکہ ان کی سازشیں بڑی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہیں اس لئے قرآن کریم نے ان سے محتاط رہنے کی بڑی شدت سے تاکید کی ہے۔ کہیں کہا ہے کہ انہیں کبھی اپنا رازدار نہ بناؤ (۳/۱۱۸) یہ تمہارے ان رازوں کو تمہارے خلاف استعمال کریں گے اور بڑی تباہی کا موجب بن جائیں گے۔ انہیں ان مقامات کے قریب بھی نہ آنے دو جہاں سے رموزِ مملکت تک ان کی رسائی ہو، چہ جائیکہ انہیں سلطنت کے کلیدی مناصب پر فائز کر دو اور فوج کے ہر شعبے میں انہیں دخیل کار بنا لو!! اس باب میں قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو اس حد تک متنبہ کر دیا کہ جو لوگ منافقین سے دوستداری کے تعلقات رکھتے ہیں، یاد رکھو! وہ بھی تمہارے اپنے نہیں ہیں۔ ([illegible]) تم ایک نظریاتی مملکت کے امین ہو۔ تمہارے سامنے کچھ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول رکھے گئے ہیں جنہیں روبہ عمل لانے کے لئے یہ مملکت وجود میں لائی گئی ہے۔ ان لوگوں کی کوشش یہ ہوگی کہ تم ان اصولوں میں مداہنت برتو۔ ان میں (COMPROMISE) کر لو۔ بس جہاں تم نے ان اصولوں میں ذرا سی بھی مداہنت برتی، تم اپنے مقام سے گر گئے۔ پھر یہ لغزش کہیں بھی تمہارے قدم ٹکنے نہیں دے گی۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ - (۶۸/۹) یہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم جھکو، کچھ یہ جھکیں۔ اور اس طرح حق اور باطل میں مفاہمت کر کے، ایک مخلوط سی پالیسی وضع کر لی جائے۔ ایسا کبھی نہ کرنا۔ یہ اپنے مقام سے ذرا سا چھوڑ، بہت سا بھی ہٹ جائیں، تو بھی ان کا کچھ نہیں بگڑے گا — یہ پہلے بھی باطل پر تھے پھر بھی باطل پر رہیں گے — لیکن اگر تم اپنے مقام سے ذرا سا بھی ہٹ گئے، تو تم کہیں کے بھی نہیں رہو گے۔ اس لئے کہ حق، اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ وہ وہاں سے سرک جائے تو باطل بن جاتا ہے۔ دو اور دو چار، حق ہے۔ اور دو اور دو چھ، باطل۔ اگر دو اور دو چھ والا دو اور دو پانچ پر آ جائے تو وہ جیسا پہلے باطل پر تھا ایسا ہی اب بھی باطل پر ہوگا۔ لیکن اگر دو اور دو چار والا، دو اور دو پانچ پر مفاہمت کر لے، تو یہ حق پر نہ رہا۔ باطل پر آ گیا۔ اس لئے حق پرست کسی سے مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

کسی نظریہ پر قائم مملکت کی یہی تو "مشکل" ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظریہ اور اصولوں کے معاملہ میں کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتی۔ اور منافقین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ان میں مفاہمت کر لے، خواہ ذرا سی بھی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے قرآن کریم بار بار تاکید کرتا ہے کہ دیکھنا! کہیں تم ان کے دامِ ہمرنگِ زمین کے فریب میں نہ آ جانا — اس باب میں، اور تو اور، خود ذاتِ رسالتمآب سے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ میں ایسا قطعاً نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کروں تو میں بھی خدا کے

عذاب سے بچ نہیں سکونگا۔ (۱۱/۴۵) ایسی صورت میں میرا بھی کوئی والی وارث نہیں رہیگا۔ (۱۱/۴۳)۔ میں ایک نظریاتی معاشرہ کا سربراہ اور محافظ ہوں۔ مجھے بڑے ہی ثبات و استقامت سے کام لینا ہوگا۔ اگر میرا پاؤں پھسل گیا تو اس مملکت کی بنیادیں ہل جائینگی۔ (۱۷/۷۴)۔

قرآن کریم منافقین اور کفار میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ اگر یہ منافقین تمہاری تنبیہات و احذارات کے باوجود اپنی سازشوں سے باز نہ آئیں، تو ان کے خلاف اسی طرح جنگ کرو جس طرح اس نظام کے کھلے دشمنوں (کفار) کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے۔ ارشاد ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (۹/۷۳) ؛ (۶۶/۹) اے رسول! ان کفار اور منافقین، دونوں کے خلاف جنگ کرو، اور ان سے قطعاً کوئی رعایت نہ برتو۔ بڑی سختی سے ان کی گرفت کرو۔ (نیز ۴/۱۴۰) حتیٰ کہ اگر کبھی اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے، تو جس طرح کفار کی اطاعت سے روک دیا گیا، اسی طرح منافقین کے متعلق بھی کہہ دیا کہ ان کی اطاعت مت کرو۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ۔ (۳۳/۱ ؛ ۳۳/۴۸) اے نبی! تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور کفار اور منافقین کی اطاعت مت کرو۔

(-)

یہ ہیں منافقین کے متعلق قرآن کریم کی تصریحات۔ ان کے بارے میں اس کے احکام و ہدایات اس قدر واضح اور متعین ہیں کہ اس نے مسلمانوں سے برملا کہہ دیا کہ ان کے متعلق تمہاری دو رائیں بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ۔ (۴/۸۸) یعنی یہ نہ ہو کہ تم میں سے کچھ لوگ یہ کہیں کہ یہ لوگ بہرحال اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، اور دلوں کا حال خدا کو معلوم ہے، اس لئے انہیں کاٹ کر الگ نہیں کر دینا چاہیئے۔ انہیں ساتھ رکھنا چاہیئے۔ اگر انہیں الگ کر دیا تو یہ دشمن کے ساتھ جا ملینگے اور ہمارے لئے بڑے نقصان کا موجب بن جائینگے ـــ یہ غلط ہے۔ جب ان کے متعلق "دلوں کا حال جاننے والے خدا" نے ایسا حتمی اور واضح فیصلہ کر دیا ہے تو کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ان کے سلسلہ میں کوئی اور روش اختیار کرے۔ تمہیں اس باب میں یکسو اور ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ دو آراء کے معنی یہ ہیں کہ تم میں تفرقہ پیدا ہو جائے ـــ اور اس میں پھر ان منافقین کی جیت ہے۔ یہ تم میں تفرقہ ہی تو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس سے محتاط رہو۔ انہیں ساتھ رکھنے کا مشورہ دینے والے، اپنے اس خیال میں کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں، جب یہ خیال اور مشورہ قرآنی ہدایات کے خلاف ہو، تو وہ کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ ایسا مشورہ دینے والے قرآنی ہدایات کو سمجھ نہیں سکے۔

اس باب میں البتہ ایک مشکل ہے اور وہ یہ کہ منافق کو پہچانا کیسے جائے۔ کافر کو پہچاننا تو نہایت آسان ہے اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے برملا کہتا ہے، اور جو کچھ کرتا ہے کھلے بندوں کرتا ہے۔ لیکن منافق کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور وہ زبان سے کچھ اور کہتا ہے۔ اور دوسرے کے دل کے اندر کوئی جھانک نہیں سکتا۔ اس لئے اس کے متعلق کیسے فیصلہ کیا جائے کہ وہ مخلص ہے یا منافق ـــ یہ دشواری، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ کو بھی پیش آئی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ سے کہا گیا کہ وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ۔ اگر ہمارا قانونِ مشیت ایسا ہوتا کہ جن معاملات کے فیصلے انسانوں نے اپنی عقل و بصیرت سے کرنے ہیں، ان کا فیصلہ بھی ہم ہی کر دیا کریں، تو ہم ایسا کر سکتے تھے کہ منافق کی پیشانی پر لکھ دیتے کہ یہ منافق ہے اور اس طرح تم اسے پہلی نظر ہی میں پہچان لیتے۔ لیکن ہمارا قانونِ مشیت

ایسا نہیں تھا۔ اس لئے اب صورت یہی ہوگی کہ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷/۳۰) تم ان کی رفتار و گفتار اور کردار و اطوار ہی سے انہیں پہچان سکو گے۔ چنانچہ آپ نے انہیں اس طریق سے رفتہ رفتہ پہچانا اور آخر الامر ایسا ہوگیا کہ "طیب" سے "خبیث" چھٹ کر الگ ہوگیا' اور مسلمانوں کا معاشرہ منافقین سے پاک اور صاف ہوگیا (۳/۱۷۸)۔ یہ نہیں ہوا کہ جب منافقین کے متعلق علم ہوگیا تو پھر بھی انہیں معاشرہ کا جزو بنائے رکھا۔ اس طرح تو وہ معاشرہ اسی زمانے میں تباہ ہو جاتا۔

(۵)

یہ ہے (مختصراً) جو کچھ قرآن کریم نے منافقین کے متعلق کہا ہے۔ آیئے ہم کچھ وقت کے لئے 'نقاب اتار کر' اس آئینے میں اپنے چہروں کو دیکھیں تاکہ ان کے صحیح خط و خال ہمارے سامنے آسکیں۔ پاکستانی معاشرہ میں اکثریت عوام کی ہے اور باقی "خواص" ہیں۔ عوام بیچارے بے خبر اور بے شعور ہیں (انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے) لیکن مخلص ہیں اور جذباتی۔ اور خواص' بہ حیثیتِ مجموعی منافق۔ ان خواص کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ لیڈروں کا۔ یعنی ان کا جنہیں ہنوز اقتدار حاصل نہیں ہوا لیکن وہ اس ناقہ لیلےٰ کے پیچھے مصروفِ صحرا نوردی اور دشت پیمائی ہیں۔ دوسرا طبقہ ہے ان کا جنہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا طبقہ ہے مذہبی پیشوائیت کا۔ یہ ہیں خواص کی موٹی موٹی شقیں۔

آپ کوئی سا اخبار یا رسالہ اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں آپ کو مختلف اشیاء کے اشتہارات نظر آئیں گے۔ ہر اشتہار میں یہ لکھا ہوگا کہ آپ اس چیز کو خرید یئے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا۔ بجد آرام ملے گا، آسائش میسر آئے گی۔ آپ کی بچت ہوگی' زندگی اطمینان اور سکون سے کٹے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ انہیں کہنا یہ چاہیئے کہ یہ چیز خرید یئے۔ اس سے ہمیں اسقدر منافع ہوگا۔ یعنی یہ مختلف فرمیں ان اشیاء کو اپنے منافع کے لئے تیار کرتی ہیں لیکن کہتی ہمیشہ یہ ہیں کہ اس سے مقصود آپ کا فائدہ ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ہمارے لیڈروں کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک گلا پھاڑ پھاڑ کر کہے گا کہ ہم عوام کی خاطر یہ کریں گے اور ملک اور قوم کی خاطر وہ۔ ہم نے اپنی ساری زندگی ان کے لئے وقف کر دی ہے حالانکہ مقصد ان کا اپنے مفاد کا تحفظ' اپنی مصلحتوں کی بر و مندی' اپنے لئے اقتدار کا حصول ہوگا۔ آپ ان لیڈروں کے پیش کردہ منشورات کو دیکھئے۔ ان میں اس قدر دلفریب وعدوں کے طومار اور پرکشش منصوبوں کے انبار نظر آئینگے کہ آپ ورطۂ حیرت میں گم ہو جائینگے۔ لیکن اس کے بعد اس کا جائزہ لیجئے کہ ان وعدوں اور منصوبوں میں سے کوئی ایک بھی پورا ہوا؟ آپ انتخابی مہم میں دیکھئے کہ یہ اپنے ووٹروں کو کس کس قسم کی درخشندہ امیدیں دلاتے ہیں۔ اور ان کے منتخب ہو جانے کے بعد دیکھئے کہ وہ انہی ووٹروں سے کس طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ منافقت' ووٹروں کے معاملہ میں ہی نہیں۔ خود اپنی پارٹی کے اراکین کے ساتھ بھی ایک دوسرے کا یہی انداز ہے اور چونکہ ان میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں اس لئے کسی کا دوسرے پر اعتماد نہیں — نہ پارٹی کے لیڈر کا ممبروں پر اعتماد، نہ ممبروں کا ایک دوسرے پر بھروسہ!

جہاں تک اس طبقہ کا تعلق ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے' وہ اٹھتے بیٹھتے' نظریۂ پاکستان، اسلامی اقدار، اسلامی نظام، اسلامی اندازِ زیست کی رٹ لگاتے رہینگے لیکن مجال ہے جو کبھی متعین طور پر بتائیں کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جنہیں ان الفاظ کا مفہوم خود بھی معلوم نہیں۔ لیکن جنہیں معلوم ہے وہ اسے دانستہ

اخفا میں رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ان کا مفہوم متعین کر دیں تو ان سے مطالبہ ہوگا کہ وہ ان مقاصد کو بروئے کار کیوں نہیں لاتے۔ اس لئے وہ اسی میں خیریت دیکھتے ہیں کہ ان اصطلاحات کو مبہم رہنے دیا جائے۔ اگر آپ کو ان کے بیانات اور تقاریر سے ہٹ کر کبھی ان کی خلوت کی محفلوں میں جھانکنے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ یہ اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر کس طرح "اسلام" "نظریۂ پاکستان" "اسلامی نظام" "دو قومی نظریہ" کا مذاق اڑائیںگے۔ یہ لوگ درحقیقت سیکولر حکومت کے قائل ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہاں کے عوام مذہب پرست واقع ہوئے ہیں' اس لئے اعلانیہ ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اعلانیہ ایسا کہنے کی جرأت تو نہیں کرتے لیکن عملاً ایسی صورت پیدا کرتے چلے جاتے ہیں کہ یہاں نظریۂ پاکستان (اسلامی نظام) قائم ہو ہی نہ سکے۔ اور (جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا) مذہبی پیشوائیت ایسا کرنے میں ان کی ممد و معاون ہوتی ہے۔ آپ کو اس سے حیرت ضرور ہوگی کہ مذہبی پیشوائیت اور سیکولر انداز حکومت کی ممد و معاون! لیکن یہ حقیقت ہے جو آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آجائیگی۔

یہاں تک تو نظریۂ پاکستان اور اسلامی نظام کے متعلق ان کے قول اور عمل کے تضاد کا ذکر تھا۔ ان سے آگے بڑھ کر ان کی سیرت و کردار کی طرف آیئے تو ان کی زندگی سر سے پاؤں تک منافقت کا پیکر دکھائی دیگی۔ اور چونکہ سربراہان کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ بنتی ہے اس لئے اس منافقت کے جراثیم وبائی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور منافقت سارے معاشرہ کا معمول بن جاتا ہے۔

لیکن منافقت کی سب سے زیادہ گھناؤنی تصویر مذہبی پیشوائیت کے ہاں نظر آئے گی۔ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنہوں نے تحریک اور مطالبہ پاکستان کی جی بھر کر مخالفت کی تھی لیکن آپ وہی لوگ "مملکت پاکستان" کے سب سے بڑے بہی خواہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس "بہی خواہی" کا صغریٰ کبریٰ یوں مرتب ہوتا ہے کہ :

(۱) پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔

(۲) تم لوگ اسلام کو نہیں جانتے۔ اسلام کے اجارہ دار ہم ہیں۔ اس لئے

(۳) زمام اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم یہاں قوانین شریعت نافذ کریں۔

اور "قوانین شریعت" (نظریۂ پاکستان کی طرح) وہ معمہ ہے جو آج تک حل نہیں ہو سکا۔ یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ آئین پاکستان میں یہ شق رکھی جائے کہ :

(۱) جہاں تک پرسنل لاز کا تعلق ہے' یہ ہر فرقے کے اپنے اپنے ہونگے۔ اور

(۲) پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائینگے جن کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں ہوگا۔

ان سے پوچھا گیا کہ صاحب! وہ کونسا اسلام ہے جس میں مذہبی فرقوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا اور جس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں امتیاز کیا گیا ہے؟ اس کا جواب کفر کے فتووں کے سوا کچھ نہ مل سکا۔

جہاں تک پبلک لاز کا تعلق ہے' ان سے کہا گیا کہ صاحب! "کتاب و سنت" کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر کے دکھایئے جو تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہو' تو اس کا جواب یہ تھا کہ ایسا مطالبہ کرنے والے منکر حدیث ہیں۔ منکر سنت ہیں' منکر رسالت ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ جانتے تھے کہ "کتاب و سنت" کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین نہیں بن سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک

متفق علیہ ہو، لیکن اس کے باوجود یہ مطالبہ کئے جا رہے تھے کہ پبلک لاز کا مجموعہ کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ آپ سوچئے کہ کیا یہ منافقت کی انتہا نہیں؟ بیس پچیس برس کی مسلسل تکرار و اصرار کے بعد، بالآخر اس منافقت کا پردہ چاک ہوا۔ اور اس مطالبہ کے سب سے بڑے داعی، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا - ۲۳)

آپ نے خیال کیا ہوگا کہ اس اعتراف کے بعد ان حضرات نے یہ مطالبہ ترک کر دیا ہوگا کہ پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ لیکن آپ کا یہ خیال خام ہے۔ وہ نقاب ہی کیا ہوا جس کا رنگ اس طرح ڈھل جائے۔ اس اعتراف و اعلان کے بعد بھی، ان کا یہ مطالبہ بدستور دہرایا جا رہا ہے کہ پاکستان میں مجموعہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔

آپ سوچئے کہ اتنی بڑی منافقت کی مثال آپ کو کہیں اور بھی مل سکتی ہے! یہ جانتے ہیں کہ کتاب سنت کے مطابق کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا اور اس کے باوجود، یہ مطالبہ دہرائے جا رہے ہیں کہ مجموعہ قوانین کتاب سنت کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ (سابق صدر) ایوب خان نے دسمبر ۱۹۶۵ء میں کہا تھا کہ:

اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ صدر نے کہا کہ یہ ایک جذباتی پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح کہ خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ صدر نے کہا کہ میں نے علماء سے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کر لیں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس قانون کے حق میں عوام کی تائید بھی حاصل کریں۔ اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اعلیٰ قانون رائج ہو۔ اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔ (نوائے وقت ۱۲/۱۲/۶۵)

اگر یہ حضرات اپنے مطالبہ میں مخلص ہوتے تو، اس دعوت پر لبیک کہتے اور ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کا مسودہ مرتب کر کے، ملک کے سامنے پیش کر دیتے۔ لیکن انہیں اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے، اس لئے ان میں سے کسی ایک نے بھی اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ اور چونکہ انہیں خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر (صدر) ایوب نے اس پر اصرار کیا تو ان کی منافقت کا پردہ چاک ہو جائے گا، اس لئے اس کے خلاف وہ جڑ بونگ مچایا کہ اسے بالآخر منصب صدارت چھوڑنا پڑا۔

اور اس کے باوجود وہ مطالبہ بدستور جاری ہے کہ کتاب و سنت کے مطابق ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے۔ اور حیرت بالائے حیرت، کہ ان کی جماعت میں سے کوئی ایک آدمی بھی یہ نہیں کہتا کہ حضرت! جب آپ خود کہتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو تو پھر ہم سے یہ قرار دادیں کیوں پاس کرا رہے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق ضابطہ قوانین مرتب ہونا چاہیئے۔

کوئی ایک آواز بھی ایسی نہیں اٹھتی، کوئی ان سے نہیں کہتا کہ خدا کے لئے اس منافقت کو چھوڑ دیجئے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت تباہ ہوئے جب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۔ (۵/۷۹)

وہ ایک دوسرے کو غلط کاموں پر روکتے ٹوکتے نہیں تھے۔

یہی حالت یہاں پیدا ہو چکی ہے۔

(۰)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ لوگ ذی اقتدار طبقہ کے اس خیال اور خواہش کے عملاً ممد و معاون ہیں کہ یہاں سیکولر نظامِ حکومت رائج رہے۔ دیکھئے کہ اس کی صورت کیا ہے۔ سیکولر حکومت اسے کہتے ہیں جس میں پرسنل لاز کی حد تک ہر ایک کو اجازت ہو کہ وہ ان پر اپنی اپنی صوابدید کے مطابق عمل کریں۔ حکومت ان میں دخل اندازی نہ ہو۔ اور پبلک لاز کا مدار مذہب پر نہ ہو۔ آپ سوچئے کہ کیا ہماری یہ مذہبی پیشوائیت یہاں بعینہٖ یہی صورت نہیں پیدا کر رہی جس میں پرسنل لاز ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں اور حکومت ان میں دخل اندازی نہ ہو۔ اور پبلک لاز مذہب (یعنی کتاب و سنت) کے مطابق مرتب ہی نہ ہو سکیں۔ یہ ہے ان حضرات کا عمل اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم یہاں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے معاشرہ میں وبائی منافقت کا عالم! سوچئے کہ کیا اس کے بعد بھی کسی کمیشن بٹھلانے کی ضرورت ہے۔ یہ دریافت کرنے کے لئے کہ ہمارے چہروں پر ذلت اور رسوائی کی وہ کالک کیوں ملی گئی ہے جس کی مثال دنیا کی کسی ذلیل ترین قوم میں بھی نہیں ملے گی، (عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۔ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۔ (۸۰/۴۰) وہ ذلت و رسوائی جس کے بعد ہم کسی کو منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہے۔ اور ہر قلب حساس سے یہ فغاں چیخ بن کر ابھر رہی ہے کہ میں یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ کیوں رہا!!

رکھیو غالبؔ تو مجھے تلخ نوائی سے معاف
آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے

جہانِ نو

• قرآنی فکر • پاکستان کا تصور • نظریۂ پاکستان • اسلامی نظامِ حیات
• اسلام کا سیاسی نظام • اسلام کا معاشی نظام • اسلام میں عورت کا مقام
• نوجوانوں کے دل کی دھڑکنیں • دنیا کے اہم تقاضے
• زمانے کی نئی کروٹیں

ان موضوعات پر

نہایت دلکش، شگفتہ و شاداب، معلومات افزا لٹریچر، ادارہ طلوع اسلام کے سوا کہیں سے نہیں مل سکیگا۔ تفصیل کیلئے — جہانِ نو — کا مطالعہ فرمائیے جو ایک کارڈ لکھنے پر بلا قیمت بھیجدیا جائیگا۔ (ناظم)

نقد و نظر

قرآنی کوہکن کی جوئے شیر

(پرویز)

میں نے، کراچی سے لاہور منتقل ہونے کے بعد ۱۹۵۸ء میں درسِ قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا۔ شرکائے محفل دیکھتے تھے کہ درس میں ایک صاحب نہایت التزام سے وقت کی پابندی کے ساتھ، بلاناغہ شریک ہوتے ہیں۔ کشیدہ قامت، کشادہ جبیں، عقابی آنکھ، رعنائی پیکر، چال جیسے کڑی کمان کا تیر، قدموں کے توازن میں سپاہیانہ انداز۔ تنومند و توانا۔ اگر سر کے بالوں کی سفیدی غماز نہ ہو تو کوئی ان کی عمر کا صحیح صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ چہرہ بشرہ تمکنت و جلال کا آئینہ دار۔ گفتار و اطوار نجابت و شرافت کے مظہر۔ وہ ٹھیک وقت پر آتے اور نپے تلے قدم اٹھاتے سیدھے اپنی مخصوص نشست تک جا پہنچتے۔ وہ نشست مخصوص صرف ان معانی میں تھی کہ ان کی کرسی کے سامنے ایک ڈیسک رکھا ہوتا۔ وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے۔ قرآن کریم کا نسخہ اور کاغذوں کا پیڈ ڈیسک پر رکھتے۔ چشمہ صاف کر کے ناک پر ٹکاتے، اور پھر کامل ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ کیفیت کہ کان انتہائی جذب و انہماک سے درس کے الفاظ پر اور ہاتھ لکھنے میں مصروف۔ درس ختم ہونے پر احباب سے نہایت خندہ پیشانی اور تبسم شیریں سے ملتے۔ مصافحہ کرتے تو ان کے ہاتھ کی گرفت اور حرارت، ان کے قلبی تپاک اور خلوصِ محبت کی گرمجوشی کی مقیاس بن جاتی۔ کامل دس برس تک ان کا یہی معمول رہا۔ باقی اوقات میں وہ اپنے کام سے کام رکھتے — معاشرہ کے عام ہنگاموں سے دور، شور و شغب سے مجتنب، کم آمیز اور رسوم و تقاریب سے بالعموم گریزاں۔ لیکن جب درس کا سلسلہ نصف القرآن تک پہنچا تو انہوں نے نہایت ذوق و شوق سے اس کے جشن منانے کا اہتمام کیا اور دس سال کے بعد جب (۱۹۶۸ء میں) درس کا پہلا دور اختتام پذیر ہوا تو انہوں نے جس جوش و خروش اور خلوص و محبت سے اس تقریب کا اہتمام کیا وہ قرآن کریم کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی کا حسین پرتو تھا۔

اس کے بعد جب درس کے دورِ نو کا آغاز ہوا تو ان کی وہ مخصوص نشست خالی رہنے لگی اور پھر اٹھا ہی دی گئی۔ چار برس تک وہ اس محفل سے غائب رہے۔ لیکن ان کا یہ غروب، درحقیقت سورج کا غروب تھا جو دوسری صبح تازہ درخشندگی کے ساتھ دوچند تابانیِ عالم ہوتا ہے۔ وہ چار برس کے بعد ایک نہایت مجلّا اور مطلّا کتاب ہاتھ میں لئے نمودار ہوئے جس کا نام ہے؛

PHENOMENA OF NATURE
AND THE QURAN.

یہ آفتابِ تازہ، ڈاکٹر سید عبدالودود کے نام سے متعارف ہے۔ دنیا انہیں ایک ماہر سرجن کی حیثیت سے جانتی تھی اور

بہت کم نگاہیں ان کے اس جوہرِ مضمر سے شناسا تھیں۔

قرآنی تعلیم کا مرکزی نقطہ تو انسانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا طریق سکھانا ہے۔ اسے، اس کی اصطلاح میں 'ہدایت' کہا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قرآن کریم میں کارگہ کائنات اور خود انسانی زندگی کے متعلق اس قدر متنوع حقائق بیان کئے گئے ہیں کہ علمِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے دائرے سے باہر ہو۔ یہ وجہ ہے جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کی مکمل تفسیر لکھنا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں' اس لئے کہ ایک فرد کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ وہ ان تمام علوم پر حاوی ہو۔ قرآن مجید کی تشریح و تبیین کا طریق یہ ہے کہ مختلف علوم و فنون کے متخصصین (SPECIALISTS) اپنے اپنے علم و فن کی روشنی میں قرآن پر غور و فکر کریں اور متعلقہ مقامات کی تحقیق و تشریح کرتے جائیں۔ اس کے بعد قرآن کی مرکزی تعلیم کے ماہرین کی جماعت' ان تحقیقات میں ربط پیدا کر کے' ایک جامع انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ ہوگی قرآن کریم کی صحیح تفسیر۔ واضح رہے کہ یہ تفسیر بھی اس باب میں حرفِ آخر نہیں ہوگی جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا' اس تفسیر پر مزید غور و تدبر ہوتا رہیگا۔

ڈاکٹر عبدالودود صاحب بنیادی طور پر سائنس کے سٹوڈنٹ ہیں۔ لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کا خصوصی تعلق علم الابدان سے ہے۔ انہوں نے دس سال تک جو نہایت گہری نظر سے قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو اس میں انہیں تخلیقِ کائنات سے لیکر زندگی کی انسانی سطح تک' ایسے عظیم حقائق نظر آئے جن میں سے ایک ایک کا عالم یہ تھا کہ —

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست —

چنانچہ ایک طرف انہوں نے قرآنی آیات پر غور و تدبر شروع کیا' اور دوسری طرف علوم سائنس کے متعلق اپنے مطالعہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے اور متقدمین سے لیکر متاخرین تک کے سائنسدانوں کی شہرۂ آفاق اور قابلِ اعتماد تصانیف کو کھنگال ڈالا۔ ان میں جو نظریات حقیقت (REALITY) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں' انہیں قرآنی حقائق کی روشنی میں پرکھا۔ اور اس طرح' دس سال کے پہلے قرآنی مطالعہ' اور چار سال کی بعد کی کوہکنی اور خارہ شگافی کے بعد اس جوئے شیر کے نکالنے میں کامیاب ہو گئے جو اس وقت ہمارے زیرِ تبصرہ ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۔ (۵۶/۷۹) اس کی تعلیم و ہدایت سے وہی لوگ صحیح طور پر متمسک ہو سکتے ہیں جو اپنے ذہن کو غیر قرآنی عقائد و تصورات سے پاک اور صاف کر کے اس کی طرف آئیں۔ اور ان کی سیرت پاکیزہ اور نگاہ پاک بیں ہو۔ مبدا فیض کی کرم گستری سے ڈاکٹر صاحب محترم کو ان خصوصیات کبریٰ سے بھی بہرۂ وافر نصیب ہوا ہے۔ قلب و دماغ ہر قسم کے غیر قرآنی معتقدات سے منزہ' اور سیرت سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان کی کتاب کو' سائنس کی عام کتابوں کی طرح خارا و یابس ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس میں آپ مصنف کے اسلام کے ساتھ شیفتگی اور قرآن کے ساتھ وابستگی کے لطیف جذبات بھی محسوس کرینگے۔

ڈاکٹر صاحب کی ژرف نگہی اور دیدہ ریزی کا صحیح اندازہ تو کتاب کے مطالعہ ہی سے لگ سکتا ہے۔ لیکن اس کی ایک خفیف سی جھلک' اس کے ابواب کے عنوانات سے سامنے آسکتی ہے۔

(۱) قرآن اور تخلیقِ کائنات — عالمِ امر و خلق و تقدیر۔

(۲) کائنات پر طائرانہ نگاہ — نظامِ فلکی۔ اجرامِ سماوی۔ بزمِ انجم۔ شہابِ ثاقب۔ شعلہ ہائے مستعجل۔ قرآنی آیات کے آئینے میں۔

(۳) سماء الدنیا کی کارفرمائیاں اور تجلیات ریزیاں۔ سقفِ محفوظ۔ میزان۔ کُنّس و خُنّس۔

(۴) کائنات کی طبیعیاتی اور کیمیاوی اساسات۔ مقسّمٰت امر و مدبرات امر۔ ملائکہ۔

(۵) کرۂ ارض کا کیمیاوی ارتقاء۔ سلالۃ من طین کی حیرانگیز وادیاں۔

(۶) کرۂ ارض پر زندگی کی نمود۔ نظامِ ربوبیت کی ناپیداکنار پہنائیاں۔

(۷) اولین جرثومۂ حیات — جہانِ رنگ و بو میں حرکت و نمو کی برکات۔

(۸) حیاتیاتی نظام۔ زندگی کی مختلف سطحیں۔ کاروانِ حیات کی متنوع منازل۔ پچاس پچاس ہزار سال کا ایک ایک دن۔

(۹) ماحول اور سامانِ نشوونما کے کرشمے۔ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی کا مفہوم۔

(۱۰) افزائشِ خویش کا حیرت فروش عمل۔

(۱۱) نفسِ واحدۃ سے تخلیق کا مفہوم۔

(۱۲) مزید منازل۔ علقۃ۔ مضغۃ۔

(۱۳) جنسی تفریق۔ متشابہا و غیر متشابہ کے معنی۔

(۱۴) قرآن اور نظریۂ ارتقاء۔

(۱۵) کرۂ ارض کے ارتقائی منازل۔ یومین۔ اربعۃ ایام۔ ستۃ ایام۔
تخلیقِ انسانی۔ خلقاً آخر۔ روح کا مفہوم۔ علمہ البیان کی عظیم حقیقت۔

(۱۶) انسان اور نظامِ کائنات۔ مومن اور متقی کا فرق۔

(۱۷) مستقل اقدارِ حیات۔ قوانینِ فطرت اور قوانینِ قرآنی — سرچشمۂ علم۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

یہ ہے ایک خفیف سی جھلک اس مایۂ ناز تصنیف کے مشمولات کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش جہاں ایک قرآنی طالبِ علم کے لئے بصیرت افروز ثابت ہوگی وہاں سائنس کے سٹوڈنٹس کے لئے بھی بیش بہا معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ قرار پائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اسلاف میں سے بعض حکماء نے قرآنی حقائق پر سائنس کی روشنی میں غور و فکر کیا ہے، لیکن ایک تو اس زمانے میں سائنسی معلومات نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی جس قدر یہ ترقی برق رفتاری سے ہمارے دور میں ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ اور دوسرے ان کا دائرہ فکر بھی محدود تھا۔ خود ہمارے زمانے میں بھی اس سمت میں بعض کوششیں ہوئی ہیں۔ لیکن جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف زیادہ جامع اور اس لحاظ سے منفرد ہے اور اس کے بعد قرآنی تحقیقات کرنے والوں کے سامنے ایک نئی شاہراہ کھولتی ہے۔ خدا کرے کہ دیگر اہلِ علم و فکر حضرات اس باب میں مزید سعی و کاوش کریں تاکہ (قرآنی الفاظ میں) انفس و آفاق میں مضمر آیاتِ خداوندی مشہود ہو کر دنیا کے سامنے آجائیں۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ۔ تاآنکہ یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حق ہے (ڈاکٹر صاحب نے اس آیۂ جلیلہ کو لوحِ کتاب کی حیثیت سے درج کیا ہے)۔

کتاب نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی فکری کاوشوں کی مظہر ہے بلکہ (صوری حیثیت سے) ان کے حسنِ ذوق کی بھی آئینہ دار ہے۔ عمدہ سفید کاغذ پر موتیوں کی طرح ترشے ہوئے ٹائپ میں مطبوعہ۔ بیشمار بلاکس (جن میں سے بیشتر خود ڈاکٹر صاحب کے اپنے مرتب و منقش کردہ ہیں) خوبصورت ٹائپ میں صدہا آیاتِ قرآنی وجہ تزئین اوراق۔ قرآنی آیات کی گلاسری (لغت)۔ دیدہ زیب مضبوط جلد۔ عنوانِ کتاب مطلا۔ یقیناً یہ بصرفِ کثیر تیار ہوئی ہوگی۔

کتاب کی قیمت:۔ -/۲۵ روپے فی جلد ہے۔ اور ملنے کا پتہ

(۱) سید خالد ودود (پبلشر) ۳۲ نسبت روڈ لاہور، (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

آخر میں، ایک حقیقت کا جھلکی ہوئی نگاہوں سے اظہار و اعتراف کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس قابلِ فخر تصنیف کو اس ہیچ میرز کے نام ان الفاظ میں منسوب کیا ہے۔

میرے فاضل اور قابل استاد، علامہ غلام احمد پرویز کے نام،
جن کی بصیرت افروز اور سحر انگیز، قرآنی فکر نے،
میرے دل میں، پیغام خداوندی پر غور و تدبر کے جذبہ اور ولولہ کو بیدار کیا۔

اس کے متعلق میں، اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ یہ، میرے اس حبیب مکرم کی وسعتِ قلب اور کشادگیٔ نگاہ کا آئینہ ہے وگرنہ من ہماں خالم کہ ہستم۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ میں قریب قریب اپنی ہر تصنیف کے آخر میں لکھا کرتا ہوں کہ میری اس کاوش سے اگر ایک قلبِ سلیم بھی چشمۂ قرآنی کے قریب آجائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزی کا صلہ مل گیا۔ اور میری یہ دعا تو میرے احباب کے اکثر میری زبان سے سنی ہوگی کہ

عمر بھر کی نواگری کا صلہ یا خدا! کوئی ہم نوا ہی دے

میں سمجھتا ہوں کہ اس مستجاب الدعوات کی بارگاہِ عالیہ نے میری اس دعا کو شرفِ باریابی عطا فرما دیا جو مجھے ڈاکٹر صاحب جیسا "ہم نوا" عطا کر دیا۔ وہ میرے ہمنوا ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں وہ مجھ سے بھی آگے نکل گئے ہیں کہ امور شمس کے متعلق میرا مطالعہ عمومی ہے، اور ان کی تحقیقات خصوصی ہیں۔

طلوعِ اسلام کی ایک کنونشن میں، ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے، اپنے صدارتی ارشادات کے آخر میں کہا تھا کہ

دعا میں ہمیشہ انسان کی "خود غرضی" پوشیدہ ہوتی ہے۔ میری دعا یہ ہے کہ۔
جب تک میں زندہ رہوں کم از کم اس وقت تک پرویز صاحب ضرور زندہ رہیں۔

اور میری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے بھی زیادہ عمر عطا فرمائے کہ وہ میری فکرِ قرآنی کے چراغ کو میرے بعد بھی روشن رکھیں — یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است۔

(پرویز)

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا ترے بعد!

پاکستان پر جو قیامت گزری، اس کی جگر سوزی سے ہنوز میرے آنسو نہ تھمے تھے کہ ۵ جنوری کی سہ پہر، حبیبِ مکرم، ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بڑے باہمت انسان ہیں اور انہیں اپنے جذبات پر کافی ضبط ہوتا ہے، اس لئے ان کی آواز کا غم آلود ہونا کسی جانکاہ المیہ کا غماز تھا۔ میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگ گیا۔ انہوں نے کہا کہ پرویز صاحب! آپ کے لئے ایک بڑی الم انگیز خبر ہے ـــــ صفدر سلیمیؔ کا اچانک انتقال ہو گیا ـــــ مجھ سے کچھ نہ کہا گیا، میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

مجھے تحریکِ خاکسار سے گہرا لگاؤ تھا ـــ طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کے اوراق اس کی زندہ شہادت ہیں ـــ اور علامہ مشرقی (مرحوم) کے ساتھ قریبی مراسم۔ ہو نہیں سکتا تھا کہ جس شخص کے اس تحریک اور اس کے قائد کے ساتھ ایسے تعلقات ہوں، وہ صفدر سلیمی سے متعارف نہ ہو۔

میں جب ۱۹۵۵ء میں، کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آیا تو صفدر سلیمی صاحب، ڈاکٹر صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ وہاں مجھے، انہیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارہ
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

مجھے محسوس ہوا کہ انہوں نے شاید اسی نوجوان کو دیکھ کر یہ کہا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ:

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

مجھے صفدر صاحب میں انہی پاکیزہ شعاعوں کی جھلک نظر آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ:

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

میں نے محسوس کیا کہ ان میں بڑی صلاحیتیں مضمر ہیں، لیکن ان کی توانائیاں موجوں کے تلاطم سے

نبرد آزمائی میں صرف ہو رہی ہیں؛ اور قطرۂ نیساں کو گہر بننے کے لئے جس سکون صدف کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں آج تک وہ میسر نہیں آیا۔ یہ چیز قرآنی فکر کی خلوت گاہوں کے سوا کہیں نہیں مل سکتی تھی انہیں بھی اس کا احساس ہوا۔ اندریں، وہ جذبہ تھا جس کے تحت وہ طلوعِ اسلام سے وابستہ ہو کر مجھ سے قریب تر ہو گئے۔

میں نے دیکھا ہے کہ جس شخص کو چار الٹے سیدھے لفظ لکھنے یا بولنے آجاتے ہیں، وہ اپنے آپ کو ہمہ دان سمجھ لیتا ہے۔ لیکن صفدر صاحب کی طبیعت اس سے بالکل مختلف تھی۔ انہیں قلم اور زبان دونوں پر عبور تھا اور عبور بھی ایسا کہ وہ گویا ان دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ لیکن اس کے باوجود، انہوں نے اپنا انداز کبیر طالب علمانہ رکھا۔ اس کے ساتھ ہی، ان کی طبع بڑی اخاذ تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ قرآنی فکر کو بڑی تیزی سے حاصل اور جذب کرتے چلے گئے۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ اسی نہج کو اپنا مستقل شعارِ زندگی بنا لیں، تو وہ آگے چل کر ملت کے مقدر کا درخشندہ ستارہ بن سکتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت کی برق پائی اور تحریکِ خاکساران کے ساتھ ان کی گہری وابستگی، انہیں بڑی شدت سے اُس طرف کھینچ رہی تھی۔ کچھ وقت تک وہ "بینائی تمنا اور صبر طلبیِ عشق" کی اس کشاکش میں مبتلا رہے، لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے لئے یکسوئی ضروری ہے تو انہوں نے اپنا پورا وقت تحریک کے لئے وقف کر دیا اور وہاں انہوں نے جو کچھ کیا اس کی شاہد اس تحریک کی حیات نو ہے۔

اس تحریک کو اُن کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ ان کی اچانک موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی طرح بھی پُر ہو سکے گا۔ وہ مردِ درویش جس کی قلندری کے سامنے کلاہِ فغفوری جھکتی تھی۔ وہ میرِ کارواں جس کی کیفیت یہ تھی کہ — نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز — اس کا بدل مشکل سے ملیگا۔ میں آج جب اس عزیز محترم کے دنوں کی تپش اور اس کی راتوں کے گداز کو یاد کرتا ہوں تو کلیجے سے ہُوک اٹھتی ہے۔ ان کی وفات پر بہت سے احباب نے مجھے تعزیت کے خطوط لکھے ہیں۔ میں انکی اس ہمدردی اور غمگساری کا شکر گزار ہوں۔ دوسری طرف، میں وابستگانِ تحریکِ خاکساران سے بالعموم، اور تحریک کے قائد محترم میاں بشیر احمد صدیقی صاحب سے بالخصوص، ان کے اس ناقابلِ تلافی صدمہ پر دلی اظہارِ غم کرتا ہوں۔ اور اُن کی طرف سے مرحوم کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے، اتنا کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گُل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی تیری نواؤں کا صلہ

فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۔

جگر فگار

پرویز